ابابیلیں لوٹ آئیں گی
ترنّم ریاض
Meer Zaheer Abass Rustmani

• ترنم ریاض نے اچھے موضوعات کا انتخاب، اور لکھنے کے لیے مناسب اسلوب اختیار کیا ہے۔ افسوس کہ یہ بنیادی اور بہت ضروری صفت ہمارے یہاں سے ناپید ہوتی جارہی ہے۔

——— نیّر مسعود

• ترنم ریاض کے افسانوں کے موضوعات اسلوب اور اظہار کی غیر رسمی تازگی اور سادگی، تشکیلی قدرت ان کے فن کے قابلِ ذکر خصائص میں سے چند ایک خصائص ہیں۔

——— بلراج کومل

• بھئی کیا کہانی لکھ دی، 'شہر' واہ واہ! شاید اردو میں یہ پہلی کہانی ہے جو مہانگری نما شہروں سے متعلق ہے۔ مبارک ہو۔

——— سیّد محمد عقیل رضوی

• ترنم ریاض اُن افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کا اظہار اور بیانیہ اُن کی اپنی ذات کے ساتھ تہذیب و ثقافت اور اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔ مجھے ترنم ریاض کی کہانیوں میں روایت کے بھرپور شعور کے ساتھ تجربہ کا رنگ بھی شامل نظر آتا ہے۔ وہ صورتِ حال کو کہانی بنانا جانتی ہیں اور اپنے زمانے کے اسلوبیاتی رویوں سے واقفیت کے باعث کسبِ فیض بھی کرتی ہیں — مجھے ترنم ریاض کے پہلے مجموعے، 'یہ تنگ زمین' کی بیشتر کہانیاں ایک سچے فنکار کی ترجمانی محسوس ہوئی تھیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ نیا مجموعہ، 'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' ان کے فنی سفر کا دوسرا پڑاؤ ہے، جو اپنے آپ میں قابلِ توجہ بھی ہے اور اپنے زمانے کے نمائندہ افسانوی رجحانات کا عکاس بھی مثال کے طور پر، 'برف گرنے والی ہے'، 'مٹی'، 'شہر'، 'باپ'، 'اماں' وغیرہ — میں ترنم ریاض کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ ان کا ادبی سفر اسی طرح جاری رہے گا۔

——— ابوالکلام قاسمی

• ترنم ریاض کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو وہ کسک ہے جسے ایک ٹیس کی طرح ان افسانوں کے بطن میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ان افسانوں کا ماحول اور سارا سیاق بے حد خاموش آگیں ہے لیکن اسی خامشی کے اندر جو بلا کا شور برپا ہے اسے ان کا قاری بہت جلد محسوس کرلیتا ہے۔ ترنم ریاض میں چیزوں کو ان کے اندر اتر کر دیکھنے کی جو صلاحیت ہے وہ ایک افسانہ نگار کے لئے بڑی نیک فال ثابت ہوتی ہے۔

——— عتیق اللہ

وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئاً وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○

اور اللہ نے تم کو نکالا تمھاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور دیے تم کو کان اور آنکھیں اور دل تاکہ تم احسان مانو۔

ابابیلیں لوٹ آئیں گی

ترنّم ریاض

یہ کتاب اُردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی

ABABEELEN LAUT AAYEN GI *(Short Stories)* **2000**
By **TARANNUM RIYAZ** **Rs. 175/-**

ابابیلیں لوٹ آئیں گی

(افسانے)

ترنّم ریاض

تقسیم کار:

نرالی دُنیا پبلی کیشنز

A-358، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی – 110002

فون: 011-3276094

ناشر : ترنم ریاض، C-11، جنگپورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی-110014

سنِ اشاعت : ۲۰۰۰ء

تعداد : چار سو

قیمت : ایک سو پچھتر روپے

کمپوزنگ : ریاض الرحمٰن، نئی دہلی

سرورق : وِجے گرافکس

طباعت : ایم۔ آر۔ آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی

زیرِ اہتمام

تنویر احمد

ملنے کے پتے:

- نرالی دُنیا پبلی کیشنز، A-358، بازار دہلی گیٹ، دریاگنج، نئی دہلی-110002
- ترنم ریاض، C-11، جنگپورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی-110014
- موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9- گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی-110002

انتساب

ریاض پنجابی

کے نام

ہیرے توں مڑ رانجھا ہوئی
اے گل ورلا جانے کوئی

—— بلھے شاہ

(ہیر تو رانجھا ہو گئی ہے، یہ بات کوئی صاحبِ نظر ہی جان سکتا ہے)

ترتیب

پیش لفظ

انسان ازل سے اپنے گردو پیش میں اپنی اہمیت کو سمجھنے کی سعی میں سرگراں ہے۔اس سعیٔ مسلسل کا سبب یہ ہے کہ وہ کائنات میں اپنے وجود کے جواز اور اس کے مفہوم کا متلاشی ہے۔ اسی تلاش پیہم میں صاحبِ نظر و فکر نے فنونِ لطیفہ کو ایجاد کیا۔ دراصل یہ ایجاد اس کے تخلیقی سرچشموں کا اظہار بھی ہے اور اس کے لیے تشفی کا سامان بھی۔ رفتہ رفتہ یہ راز بھی ظاہر ہوا کہ دنیا میں بہت لوگ تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تو ہیں مگر ان صلاحیتوں کے اظہار و استعمال کے فن سے معذور ہیں۔ کچھ لوگ اظہارِ خیال کی صلاحیتوں سے زیادہ مالا مال ہیں اور کچھ ذرا کم۔اس لیے کسی فن پارے کو لوگ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ پذیرائی بخشتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے فن پارے کو ہر شخص اپنی کہانی اگر نہ سمجھے تو کم از کم اپنی کہانی کا کوئی حصہ ضرور محسوس کرے۔

ہر انسان اپنے حسی اضطراب اور روحانی اسرار لیے جیتا ہے۔ دنیا کا ہر ذی روح اپنے ساتھ ایک کہانی لے کر چلتا ہے۔ کسی کی کہانی مختصر ہوتی ہے کسی کی طویل۔ کبھی دردانگیز کبھی پُرمسرت۔ مگر یہ دونوں کیفیات دیرپا نہیں ہیں۔ وقت کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جن میں ہماری زندگیوں کے واقعات و حادثات جنم لیتے ہیں، افسانے بن جاتے ہیں۔

نئی صدی میں داخل ہوتے ہوئے اور عالمی گاؤں (Global Village) کی جاندار شئے ہوتے ہوئے بھی میری اپنی اندر کی ایک دنیا ہے۔ میں تخلیقی عمل کو شاعری موسیقی یا آرٹ تک ہی محصور نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے احساس ہے کہ ٹیکنالوجی کی بادشاہت قائم کرنے والا بل گیٹس بھی ایک تخلیق کار ہے جس کی پھیلتی ہوئی سلطنت نے دنیا کے ہر قلم کار کے تخلیقی عمل کو متاثر کیا ہے۔ میری نظر میں نام چومسکی بھی ایک بہت بڑا تخلیق کار ہے کہ اُس کی تحریریں امریکی سیاسی اور معاشی نظام کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ایک امریکی شہری ہونے کے باوصف امریکی

سماج پر اُس کی طنزیہ تحریریں کسی فن پارے سے کم نہیں ہیں۔ ولیم سمرسٹ ماہم، ایڈگر ایلن پو اور آلودس ہاکسلے سے اُس کے موضوعات کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ چیخوف، موپاساں اور ترگنیف ایک مخصوص دور کی پیداوار ہیں۔ ان کا مقام اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ لیکن سول زی نیون کی کینسر وارڈ ایک ایسا شاہکار ہے جو ایک زوال پذیر معاشرے کی عکاسی اِس طرح کرتا ہے کہ اِس کی تعبیر کچھ دہائیوں کے بعد ایک عظیم سلطنت سوویت یونین کے ٹوٹ کر بکھر جانے میں نظر آتی ہے۔ میری نظر میں ایلوِن ٹافلر کا مقام تخلیق کاروں کی اوّلین فہرست میں شامل ہونا چاہیے۔ گو کہ اُس نے رسمی طور پر ایک بھی کہانی نہیں لکھی، لیکن نظامِ تعلیم سے لے کر جنگی نظام تک ہر موضوع پر تحریریں قلم بند کی ہیں۔ یہ عظیم فنکار بھی میری زیرِ نظر رہتے ہیں۔ میرے قلم میں وسعت بخشتے رہتے ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ دنیا تضادات کا مجموعہ ہے۔ میری نظر میں یہ تضادات افسانوں کی تخلیق میں ایک بہت بڑا رول ادا کرتے ہیں۔ تضادات قائم رہیں گے اور میرے افسانے بھی میری تخلیقی صلاحیت اور قابلیت کے حساب سے ظہور پذیر ہوں گے۔

اپنے گردوپیش تبدیلیوں کو محسوس کر کے میں کبھی کبھی خوش ہوتی ہوں کبھی رنجیدہ۔ میں انسانوں کے بدلتے ہوئے خیالات، کردار، اطوار، طرزِ زندگی کا بغور مشاہدہ کرتی ہوں۔ انسانی احساسات کو اپنے تخلیقی نہاں خانوں میں محفوظ کر کے کہانیوں اور افسانوں کا روپ دیتی ہوں۔ تخلیق کا یہ سفر میرے لیے اذیت ناک بھی ہے اور تسکین آمیز بھی۔

میں نے افسانہ 'شہر' جس کرب سے گزر کر لکھا ہے۔ وہ بیان سے باہر ہے کہ اسے خوشخط لکھنے کے خیال سے مجھ پر یاسیت طاری ہو جاتی تھی۔ افسانے کو دانستاً فراموش کرنے کی کوشش کرنا پڑتی تھی۔ یہاں شائع ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد جب میں نے اس کی فوٹو کاپی پاکستان بھیجی اور وہاں سے کچھ سات ماہ بعد چھپ کر آنے پر مجھے اتفاق سے معلوم ہوا اُس میں ایک جگہ کمپوزنگ کی غلطی تھی کہ وہ صفحہ اچانک سامنے آگیا ورنہ سالم افسانہ پڑھنے کی جراٴت میں اپنے آپ میں آج تک دوبارہ پیدا نہ کر سکی۔

افسانہ 'مٹی' نے بھی از حد رنجیدہ کیا تھا مجھے۔ اس افسانے کو تحریر کرنے سے پہلے میں کچھ دیر کے لیے اُس ماحول میں رُکی تھی۔ وہاں کی گھٹن، درد، کرب اور ہر شے پر محیط مایوسی میرے اندر جذب ہو گئی تھی تب 'مٹی' کا ظہور ہوا تھا۔ اس مجموعے کی دوسری کہانیاں جیسے

'ایجاد کی ماں' اور 'میرا پیا گھر آیا' لکھتے وقت میں نے روحانی سکھ بھی پایا تھا۔ 'آدھے چاند کا عکس' لکھتے وقت میرا دِل ممتا سے سرشار رہا اور 'باپ' جیسی کہانیوں نے مجھے ذہنی تناؤ سے دوچار کیا۔

میں وقت کی دھارا میں شامل بھی ہوں اور اُس سے الگ بھی۔ میرا وجود کئی حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان الگ الگ حصّوں کی تال میل سے (کبھی دانستہ اور نادانستہ) میرے افسانے جنم لیتے ہیں۔

اپنے تحریری سفر میں کبھی کبھی حالات اور کبھی واقعات میری سدِ راہ ہوتے ہیں۔ وہ میری رفتار کو کچھ وقفے کے لیے دھیما تو ضرور کرتے ہیں لیکن وہ مجھے روک نہیں سکتے۔ اسی طرح کچھ حالات اور واقعات میرے لیے حوصلہ افزا بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ مجھے نہ تو متاثر ہی کرتے ہیں اور نہ ہی exite۔ میرا تخلیقی سفر میرا اپنا سفر ہے، جس میں صرف میں ہوں۔ فقط میں۔

—— ترنّم ریاض

پران پران زیو تہ تال گجم ژہ یوگہِ کراہَ تجم نہ زاہنہ
سمرن بھران زیو تہ اُنگج گجم مَنٛج دلَی مالہِ ژٔجم نہ زاہنہ

——للہ دید

(پڑھتے پڑھتے میری زبان اور تالو گھس گئے مگر میں تمہارے معیار کے مطابق کام نہ کرسکی
تسبیح پڑھتے پڑھتے میری زبان اور انگلی گھس گئی من کا میل مگر ڈھل نہ پایا)

آدھے چاند کا عکس

پھول سا چہرہ اترا دیکھ کر میرا پُر سکون دل دھک سے رہ گیا۔ میں تو انھیں ہمیشہ کی طرح خوش و خرم کھلا کھلا دیکھنا تصوّر کر رہی تھی۔ پھر یہ پتھر سی خاموشی! چہ معنی دارد۔

ابھی کچھ مہینے پہلے ہی کی بات ہے۔ سالگرہ کی ایسی ہی ایک تقریب میں شرکت کر کے لوٹے تھے چہرے سے خوشی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ سر پر کاغذ کی لمبی سی تکونی چمکتی ہوئی ٹوپی پہنے ہوئے تھے ہاتھ میں تحفہ کے بدلے میں ملے ہوئے تحفے کا چھوٹا سا پیکٹ۔ گریبان پر کیک کی سوکھی ہوئی کریم۔ نرم نرم بھرے بھرے رخساروں پر مہین مہین سی افشاں جو جنم دن کے کیک کے اوپر لٹک رہے غباروں کے پھوڑنے سے اڑ کر چاروں طرف بکھرتے ہوئے ان کے گالوں سے بھی جا چپکی تھی۔ آنکھوں کے نچلے پپوٹوں سے لگی آنسو کے قطرے کی نصف جسامت کے برابر پسینے کی ننھی سی بوند جو اس بات کی شاہد تھی کہ خوب دھما چوکڑی ہوئی ہے۔ اور مزے لوٹے گئے ہیں۔ ویسے بھی انھیں پسینہ کچھ زیادہ ہی آتا ہے۔

یہ ہیں ہمارے ساڑھے گیارہ سالہ صاحبزادے عاطف...... جلد کا رنگ کھلا ہوا گندمی، آنکھوں کی رنگت شہد جیسی، وزن نارمل سے کوئی ۵ کلو زائد، شوق ستاروں اور سیاروں کی کھوج کرنا فی الحال کتابوں اور الیکٹرانک میڈیا سے بعد میں آسمان کا سفر کر کے۔ کسی بھی موضوع پر جدید ترین معلومات سے واقفیت، سکول کویز میں ہمیشہ اوّل آنا، کوئی بھی چھپا ہوا کاغذ بغیر پڑھے نہ چھوڑنا۔ سکول بس، گاڑی، بیت الخلا، مسہری، ہر جگہ مطالعہ میں مصروف رہنا یا پھر کمپیوٹر کے اسرار و رموز کا حصہ بن جانا۔

ان کا چہرہ گول ہے اور ناک ترشی ہوئی، دہانہ چھوٹا سا، دانت موتیوں جیسے، بھرا بھرا نرم نرم سا سراپا، یعنی ساڑھے گیارہ برس کی عمر میں بھی پانچ، چھ سالہ گل گوتھنے سے کہ بے تحاشا

لپٹا لینے کو جی چاہے۔ یعنی پچھلے پانچ چھ برس سے چہرے کی معصومیت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔
کہیں بھی جاتے آکر مجھے ایک ایک بات سناتے۔ بھلے سکول میں زپ (Zip) کھلی رہ جانے پر بچّوں کے Shame, Shame کہنے کی بات ہی کیوں نہ ہو۔ تقریب سے آتے ہی سنانے لگے کہ عامر کی امّی نے انہیں کتنا پیار کیا۔ اور سب بچّے ان ہی کے ساتھ تصویر کھنچوانا چاہتے تھے۔

"آپ سب سے اچھے جو ہیں۔" میں نے آنکھ سے لپٹی پسینے کی بوند پونچھ کر کہا تھا۔

"سب میں سے کون اچھا لگ رہا تھا...... ہمارا شہزادہ ہی نا؟" میں نے پیار سے کہا۔

"نینا ہی لگ رہی تھی مگر۔" وہ تحفہ میز پر رکھتے ہوئے بولے اور کچھ سوچنے لگے۔

"مگر کیا......" "وہ تو عیسائی دلہن کے لباس میں پری سی لگ رہی تھی۔

"میں نے بالکنی سے دیکھا تھا اسے" میری بٹیا نے کہا جو ان سے ڈیڑھ برس بڑی ہے۔

"ہاں لگ تو رہی تھی مگر اس کی ناک موٹی ہے نا، اگر تھوڑی سی پتلی ہوتی میرا مطلب ہے لمبی ہوتی تو بہت اچھی لگتی۔" وہ کچھ رُک رُک کر بولے۔

"ایشوریا رائے سی لگتی نا۔؟" عناب بولی۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔ مگر ایشوریا رائے کی ناک کچھ چھوٹی ہے۔ وہ انڈین کم اور جاپانی زیادہ لگتی ہے۔" وہ جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے بولے اور میں حیرت زدہ سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ ان کے مشاہدے پر حیراں......

"ہاں جاپانی گڑیا سی" عناب نے کہا۔

"اسے تو دنیا کی حسین ترین لڑکی قرار دیا گیا تھا......" میں نے بحث سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ...... ماماں، مجموعی طور پر تو خوبصورت ہے نا۔ جواب بھی اچھے دیئے تھے اس نے ججوں کو۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنا تحفہ کھولنے لگے۔

"پر مادھوری تو سب سے خوبصورت ہے۔ ہے نا عاطف؟" عناب نے اپنے سوال کی تائید چاہی۔

"اس کی گردن موٹی ہے۔ سائڈ پوز میں بھدی لگتی ہے۔" وہ تحفے پر لپیٹا گیا کاغذ ردّی کے ڈبے میں ڈالتا ہوا بولا۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ وہ کسی بھی چیز کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو بہترین طریقے سے پرکھ اور پیش کر سکتے ہیں مگر اس انداز کی گفتگو میرے سامنے پہلی بار ہو رہی تھی۔

"اچھا یہ بتایئے...... وہ جو نینا کی کزن آپ کے جنم دن پر آئی تھی ساکشی۔ وہ کیسی ہے؟" میں نے ان کے پاس بیٹھ کر کہا۔

"یہ دیکھیے ماماں...... اچھا ہے نا" اس نے تحفے میں ملا چاکلیٹ سے بھرا ٹفن باکس میری گود میں رکھ کر کہا...... اور مسکرا کر مجھے دیکھنے لگا میں بھی مسکراتے ہوئے اپنے جواب کا انتظار کرنے لگی کہ اس لڑکی ساکشی کا حلیہ عاطف سے بہت ملتا تھا۔ مگر وہ کچھ زیادہ ہی گول مٹول سی تھی، نقوش تیکھے تیکھے سے بھی تھے۔

"وہ......" وہ زور سے ہنسے۔

"وہ...... وہ موٹی ہے...... ماماں...... اکثر موٹے لوگ ایک جیسی شکل وصورت کے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ بوڈی (Body) کے فیٹس (Fats) سارے وجود کو گول گول سا کر دیتے ہیں اور چہرہ ایکدم دائرہ ہو جاتا ہے۔ جب تک فیس (Face) کے اصلی فیچرز (Features) دکھائی نہ دیں، صورت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

وہ ہم دونوں کو چاکلیٹ کا ایک ایک ٹکڑا پیش کر کے اپنا چاکلیٹ آگے کے دانتوں سے کترنے لگا۔

"موٹے تو جناب بھی اچھے خاصے ہیں......" عناب نے ان کا پیش کردہ چاکلیٹ عجلت سے زبان پر رکھتے ہوئے ناک سکیڑ کر کہا۔

"ہاں میرا وزن ۳۵ کلو ہونا چاہیے اور میں ۴۰ کے قریب ہوں مگر میں نے کب کہا کہ میں Mr. India ہوں۔ پھر بھی وزن کم کر رہا ہوں۔ میں نے کیک کھانے سے انکار کیا تھا تو نینا کی ممی نے کھلاتے کھلاتے میرے کالر پر بھی مل دیا۔

عاطف نے سنجیدہ سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ اپنے آپ پر عناب کے فقرے کا اثر انھوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور نہ ہی انہوں نے عناب سے اپنا چاکلیٹ واپس مانگا۔ گو کہ واپس مانگے جانے کے خدشے کے پیش نظر عناب نے جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی چاکلیٹ منہ کے حوالے کر دیا تھا۔

"اچھا بتاؤ...... وہ کیسی ہے...... وہ ہالی ووڈ ایکٹریس...... جولیا رابرٹس...... وہ اسٹیپ مام (Stepmom) والی......" عناب نے پوچھا۔

"وہ بھی ٹھیک ہے...... مگر اس کا ماؤتھ (Mouth) (دہانہ) بہت بڑا ہے۔"

وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگے پھر پلٹ کر میرے قریب آگئے۔

"آپ کو پتا ہے ماماں...... ایلینز (Aliens) نہیں ہوتے۔" اس نے اپنے نرم نرم ہاتھ میرے شانوں پر رکھ کر کہا۔

"جی نہیں...... ایلینز ہوتے ہیں...... آپ اپنی جنرل نالج (General Knowledge) کسی اور پر جھاڑیے۔" عناب اسے میرے قریب دیکھ کر میرے ساتھ لگ کر بولی۔

"نالج نہیں...... میں سچ کہہ رہا ہوں...... نہ ہی Aliens ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے Saucershaped جہاز (اڑن تشتریاں) اور اگر کوئی Unidentified Flying Objects (U.F.O's) ہوں بھی تو ماہرین ابھی disclose نہیں کر رہے۔

"تو پھر وہ کیا تھا جو آسمان میں مسٹر اور مسز ٹرنٹ (Trent) کو تیرتا ہوا نظر آیا تھا۔" عناب نے ان کے چہرے کے سامنے شہادت کی انگلی نچا کر کہا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گود میں رکھ دیا۔

"ان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ برطانیہ کی ہی ایک ویلی (Valley) (وادی) میں سائنس دانوں نے ایک بڑی لیب (Lab) میں کچھ (Secret) قسم کے آلات اور گول ساخت کے جہاز بنانے کی کوشش کی تھی جو Stream lined جہازوں کی پھرتی سے ہوا میں اڑ سکیں۔" وہ میرے شانوں سے ہاتھ ہٹا کر بولے تو میں نے ہاتھ پکڑ کر نرم نرم ہتھیلی کا بوسہ لے لیا۔

"پھر اب کیسے معلوم ہوا۔" عناب نے حیرت اور دلچسپی سے پوچھا اور کھڑی ہو گئی۔

"اب انہوں نے خود ہی یہ راز ظاہر کر دیا...... پچاس برس تک لوگوں کو کنفیوژن (Confusion) میں رکھ کر...... مگر اب بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لوگ اس بارے میں الگ الگ باتیں بتاتے ہیں"۔

وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔

عاطف خاموش ہوتے تو اپنی عمر کے بھولے سے بچے کی طرح نظر آتے مگر جب بولتے تو اسقدر خود اعتمادی اور معلومات کے ذخیرے کے ساتھ کہ معلوم ہوتا کہ کوئی بالغ آدمی ان کے اندر جا بیٹھا ہے جسے کائنات کے تقریباً ہر حصے کی معلومات ہے۔ انہیں کبھی میں نے وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ ہی اس طرح گم سم سا پایا۔

آج وہ اپنے ایک اسکول کے دوست کی سالگرہ کی محفل سے لوٹے تھے۔ بھاری بھاری سے قدم اٹھاتے ہوئے، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے۔ آج انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں

دروازے کی گھنٹی بھی نہیں بجائی تھی۔

بیپ بیپ......بیپ بیپ بیپ......بیپ بیپ بیپ۔

بس ایک بار انگلی بٹن پر رکھی۔ میں نے دروازے کی محدب آنکھ سے جھانک کر دروازہ کھول دیا اور باہیں پسار دیں۔ وہ بغیر میرے چہرے کی طرف دیکھے سمٹے سمٹے سے میرے ساتھ لگ گئے۔ دھیرے سے سلام کیا اور سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے میں پریشان سی پیچھے چل دی۔ انہوں نے بے دلی سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیکٹ کو مسہری پر پھینکا اور کچھ سیکنڈ کے لیے مسہری کے کنارے پر بیٹھ کر اس طرح لیٹ گئے کہ ان کے پاؤں فرش پر سے کچھ اوپر اٹھے رہے۔ میں قریب گئی تو چھت کو تک رہے تھے۔

''کیا بات ہے ہمارے شہد رنگ والے شہزادہ کو؟'' میں نے ان کا رخسار الٹے ہاتھ سے سہلاتے ہوئے پوچھا اور مسہری کے کونے پر ٹک گئی۔

''کچھ نہیں ماماں...... میں تھک گیا ہوں۔''

انہوں نے سر میرے زانو پر رکھ دیا۔

''کیا بہت کھیلے آج''؟ میں نے بال سہلائے۔

''نہیں تو...... میں تو آج کھیلا بھی نہیں۔''

''کیوں کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔''

''نہیں ماماں...... سونا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے آنکھیں بند کر لیں تو میں نے ان کے جوتے اتار کر ٹانگیں مسہری پر چڑھا دیں اور بتی گل کر کے دروازہ بند کر دیا۔

گھر کا باہری دروازہ کھلتے بند ہوتے ہوئے اس زور سے چنگھاڑتا ہے کہ ہاتھی بھی شرمندہ ہو جائے۔ میرے شوہر جب لوٹے تو میں نے سوچا کہ اس آواز سے عاطف جاگ گئے ہوں گے اور باہر آجائیں گے۔ مگر وہ شاید گہری نیند سو رہے تھے۔

کچھ دیر بعد کھانے کے لیے بلانے گئی تو دیکھا کہ اندھیرے میں آنکھیں کھولے سوچوں میں گم ہیں۔

یہ ایک انہونی سی بات تھی۔ میرا ممتا بھرا دل تڑپ اٹھا۔

میں نے ہلکی روشنی والا بلب روشن کیا۔ پاس بیٹھ کر نرم نرم ابرووں پر انگلیاں پھیریں، مکھڑا چوما اور ان کی آنکھوں میں خاموشی کی وجہیں تلاش کرتی مسکرا دی تو وہ جواباً

ہونٹ کے ایک کونے کو کان کی طرف خم دے کر جھوٹ موٹ کی مسکراہٹ ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ چہرے پر اداسیوں کے سائے آڑے ترچھے لہرا رہے تھے۔

"چلیے کھانا کھاتے ہیں۔" میں نے سہارا دے کر اٹھایا۔

"پاپا آگئے......؟" انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"آپ نے دروازے کی چیخ نہیں سنی۔" میں نے حیرت سے دریافت کیا کہ اس آواز سے سب سے زیادہ بیزاری کا اظہار عاطف ہی کیا کرتے۔

"آپ نے قبضوں میں تیل ڈلوادیا ہوگا۔"

"نہیں بیٹا...... پچھلے ہفتے ڈلوایا تھا۔ میں نے سوچا آہستہ آہستہ آواز جاتی رہے گی...... اب کل ڈلوادوں گی۔"

وہ ہاتھ منہ دھو کر آئے تو منصور ان کے قریب چلے گئے۔

"جاگ گئے بیٹا آپ" انہوں نے ان کے رخساروں پر ہاتھ رکھے تو یہ ان سے لپٹ گئے قد ان کا بھی خاصہ بڑھ گیا تھا مگر منصور چونکہ کافی طویل قامت تھے اس لیے عاطف ان کے پیٹ میں منہ چھپا کر کچھ لمحے چپ رہے پھر سر اوپر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہم سوئے نہیں تھے پاپا، بس لیٹے تھے۔" وہ ہونٹوں کو بے بسی سے سکیڑ کر بولے تھے۔

کھانے کے دوران وہ میرے برابر کی نشست پر بیٹھے بار بار سوچوں میں ڈوب جاتے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

منصور سونے کے لیے کمرے میں داخل ہوئے تو عاطف بھی اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ان کے پاس مسہری پر جالیٹے۔ میں جب کمرے میں آئی تو انہوں نے نرم سی ٹانگ اپنے پاپا کے پہلو پر چڑھا رکھی تھی اور بے خبر سو رہے تھے۔ منصور آنکھیں بند کیے ان کا سر سہلا رہے تھے۔

"کیا آپ نے کبھی محبت کی ہے"؟ صبح کی چائے کے وقت منصور نے اچانک مجھ سے یہ سوال کیا تو میں ٹپٹا سی گئی کہ منصور تو شادی سے پہلے کی میری محبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

"جی...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔" میں کھسیانی سی ہو کر بولی تھی۔

"جناب ہم نہیں...... یہ آپ کے صاحبزادے پوچھ رہے تھے کل۔" انہوں نے زوردار

قہقہ لگایا۔

"جب رات میرے پاس لیٹے تو کافی وقت میرے چہرے کی طرف چپ چاپ دیکھنے کے بعد انہوں نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا تھا کہ پاپا..... آپ نے کسی سے پیار کیا ہے کبھی..... ہم نے جواب دیا کہ آپ سب سے کرتے تو ہیں ہم بہت بہت پیار..... تو بولے کہ نہیں پاپا یہ نہیں..... جب آپ میری عمر کے تھے..... تب..... تو ہم نے کہا کہ کرتے تھے جینا لولو بریگیڈا سے..... مگر آپ سے کچھ بڑے تھے ہم۔ تو بولے اوہ نو پاپا..... پلیز بی سیریس (Oh no Papa, Please be serious) وہ تو اطالوی اداکارہ تھی۔ میں تو سچ مچ کی لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔ تو ہم نے کہا اچھا ہم یاد کریں گے۔ اور صبح آپ کو بتا دیں گے۔ اب آپ سو جایئے..... سکول بھی جانا ہے نا کل..... آپ تھکے بھی ہوئے ہیں۔ تو کہنے لگے کہ نہیں پاپا..... میں تھکا نہیں ہوں..... اصل میں..... مجھے..... کچھ دیر خاموش ہوئے۔ اور پل بھر بعد سو گئے۔" منصور ساری بات بتا چکے تو کچھ سوچنے لگے۔

"عجب سوال ہے یہ..... اس عمر کے لیے..... پتہ نہیں کیوں پوچھ رہے تھے۔" وہ مسکراتے ہوئے چائے کی پیالی میں چمچ گھمانے لگے۔

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔" میں چپ چاپ چائے کے گھونٹ بھرتی رہی۔ اور پتہ نہیں کیا کیا سوچتی رہی۔

الارم کی آواز سے عاطف جب بیدار ہوا کرتے تو ہم دونوں کے کمرے میں آکر بوسوں کے لین دین کے بعد اپنے غسل خانے کی طرف روانہ ہوتے۔ میں اسی خیال میں تھی کہ یاد آیا کہ وہ ہمارے کمرے میں سوئے ہیں۔

"اٹھیے بیٹا..... سکول جانا ہے۔" میں نے بال سہلائے تو وہ دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گئے۔ مگر اگلے ہی پل انہوں نے ایکدم آنکھیں پوری کھول دیں۔ کچھ لمحے میری طرف دیکھا پھر ایک ادھوری سی انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھے۔ میں نے ماتھے کا بوسہ لیا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر دونوں آنکھوں میں باری باری جھانکا۔

"نیند پوری نہیں ہوئی..... شہدیلے نینوں کی۔"

میں جب بھی شہد رنگ کی جگہ شہدیلا کہتی تو وہ ہنس دیتے۔ مگر اس وقت وہ مسکرائے بھی نہیں۔

''ہو گئی ماماں...... ''انہوں نے میرے ہاتھ اپنے چہرے سے الگ کر کے اپنی گردن میں ڈال دیئے اور میرے شانے پر سر رکھ دیا۔

''تیار ہو جائیے نہ...... بس، بس (Miss) ہو جائے گی۔ ''میں نے انہیں لپٹا کر کہا۔

کچھ بے دلی سے تیار ہو کر وہ سکول چلے گئے تو میں سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ یہ آخر خاموشی جیسی چیز ہے کیا۔ سکول سے لوٹ کر وہ دوپہر کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں آ گئے۔

''سوئیے گا نہیں جان؟ ''میں نے رخسار تھپتھپا کر پوچھا۔

''آپ کے پاس سوئیں گے...... ''انہوں نے آہستہ سے کہا اور میرے برابر لیٹ گئے۔ چھت کو تکتے ہوئے پلکیں جھپکتے رہے۔

''ماماں...... ''انہوں نے پُراسراری آواز میں پکارا۔

''آپ کو نیند نہیں آ رہی......؟ ''وہ مسلسل چھت کو دیکھتے ہو بولے۔

''آپ کو آ رہی ہے بیٹا؟ ''میں نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں...... ہاں...... تھوڑی سی...... ماماں؟''

''جی میری جان!''

''آپ نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟''

''میں نے آپ سے کیا ہے نہ...... بہت سا پیار...... آپ سب کو پیار کرتی ہوں میں۔'' میں نے وہی جواب دیا جو مجھے دینا چاہیے تھا۔

''ہاں وہ...... وہ تو ہے...... میں اس پیار کی بات نہیں کر رہا...... کسی لڑکے سے آپ نے پیار کیا ہے۔''

''ہاں...... آپ کے پاپا سے۔''

''شادی سے پہلے......؟''

''ہاں مگر منگنی ہو جانے کے بعد۔''

''تو تب آپ کتنی بڑی تھیں؟''

یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس کی۔''

''مگر میں تو ابھی الیون پلس (Eleven plus) ہی ہوں'' وہ دھیرے سے بولے۔

''تو؟ ''میں نے دل میں بیدار ہونے والے تجسس کو آواز میں ظاہر نہ ہونے دیا۔

”آپکو کسی سے محبت ہو گئی ہے؟“

”نہیں ماماں...... پتہ نہیں......“

”پتہ کیوں نہیں...... بتائیے نا...... ہم تو آپ کی ماں ہے نا......“

”مماں پاپا سے کچھ نہیں چھپاتے...... یاد ہے نہ۔“میں نے لہجے میں پیار گھول کر کہا۔

”جی...... یاد ہے۔“

”تو بتائیے نا۔“

”آپ...... ایک پرومز کیجیے۔“وہ پلٹ کر میری طرف مڑے۔

”وعدہ......“میں نے ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

”آپ کسی سے بھی نہیں کہیں گی نا۔“

”نہیں......“

”پاپا سے بھی نہیں۔“

”جی نہیں...... بالکل نہیں۔ یہ تو ہم ماں بیٹوں کا سیکریٹ (Secret) ہے۔“
میں نے مسکرا کر کہا۔

”ماماں آپ کو پتہ ہے...... ساحل کی ایک کزن بھی تھی پارٹی میں۔“
ان کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بس ایک ہی کزن؟“

”نہیں نہیں...... تھیں تو اور بھی...... بہت سے دوست بھی تھے...... مگر اس کی وہ کزن بہت اچھی تھی......“وہ اپنے ناخنوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔

”اچھا......؟ وہ کیسے۔“

”وہ ہم سب کے ساتھ کھیل رہی تھی...... باقی لڑکیاں تو......
...... ماماں......؟“انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر پکارا۔

”ماماں...... یہ لڑکیاں اتنی اسٹیوپڈ (Stupid) کیوں ہوتی ہیں؟“

”نہیں تو بیٹا۔ آپ کی باجی کیا بدھو ہیں؟“

”نہیں باجی نہیں...... یہ لڑکیاں...... ایسے ظاہر کرتی ہیں جیسے وہ کوئی VIP ہوں اور ہم سب انہیں کسی بات کے لیے ریکویسٹ (Request) کرنے والے ہوں۔ کسی نے اگر کلاس

میں کچھ پوچھ لیا تو شٹ اپ (Shut up) کہہ دیتی ہیں...... خوامخواہ ہی۔ جیسے سارے لڑکے بیوقوف ہوں اور وہ بہت برلینیٹ (Brilliant) ہوں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگے۔

"وہ ابھی چھوٹی ہیں نا۔ جب آپ لوگ بڑی جماعتوں میں جائیں گے تو وہ آپ سے فرینڈلی (Friendly) ہو جائیں گی...... آپ کے ساتھ پڑھیں گی، آپ سے سوال پوچھیں گی...... جواب بتائیں گی۔ جیسے باقی لڑکے آپ کے دوست ہیں ویسے ہی وہ بھی بن جائیں گی۔"

"ہماری ٹیچرس بھی لڑکیوں کی بات کا بھروسہ کرتی ہیں...... چاہے وہ جھوٹ ہی کیوں نہ بولتی ہوں...... ٹیچرس ان کو آگے کی کرسیوں پر بٹھاتی ہیں...... اور ہم کو پیچھے۔"

"وہ بیٹا...... قد کی وجہ سے، آپ لمبے ہوں گے نا، اس لیے تاکہ سب کو بورڈ نظر آئے۔

"نہیں ماما...... سر (Sir) جب ہوتے ہیں تو سب کو ہائٹ (Hight) کے مطابق بٹھاتے ہیں۔ بس میم (Madam) ہی ہیں جو......."

"یہ تو غلط ہے۔ میم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے...... مگر اس میں لڑکیوں کا کیا قصور...... آپ کو لڑکیوں کی عزت کرنی چاہیے۔"

"اگر وہ ہمیں ریسپیکٹ (Respect) دیں گی تو نا؟"

"آپ بھلے ہی ریسپیکٹ (Respect) ظاہر نہ کریں مگر دل میں ہر ایک کے لیے عزت رکھیں۔"

"لڑکیاں بہت اچھی بھی ہوتی ہیں بیٹا...... یہ تو تربیت پر منحصر ہے۔"

"ہاں...... کوئی تو بہت اچھی ہوتی ہے۔ جیسے ساحل کی کزن۔"

"آپ کو وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔"

"جی ماماں...... میں جب سے پارٹی سے آیا ہوں نا۔ انہیں کو یاد کرتا ہوں......

ان کا ہمارے ساتھ کھیلنا...... ان کی باتیں...... ان کا لباس، ان کا فیس (Face)۔" وہ اداس سے ہو گئے۔

"وہ بہت سندر ہیں؟"

"او...... ماماں...... بہت...... She is a perfect beauty۔

ان کے فیس (Face) میں ایک بھی چیز Unattractive نہیں ہے۔"

"وہ بھی ساتویں درجے میں پڑھ رہی ہیں؟" میں نے ان کی باتوں سے پیدا ہونے والی حیرت کو قابو میں رکھتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں وہ تو Tenth میں ہیں۔" انہوں نے کچھ ایسے فخر سے کہا کہ ان کی شہد رنگ آنکھیں چمک اٹھیں اور سارے چہرہ پر کوئی لطیف سا جذبہ چھا گیا۔ پھر کچھ پل بعد ہی اپنی اداسی کو واپس اوڑھتے ہوئے بولے۔

"آپ نے پیار کیا ہے ماماں...... شاید...... پیار میں یاد آتی رہتی ہے نا...... اور نیند بھی نہیں آتی...... کھانا کھاتے ہوئے اگر دیدی کی یاد آجاتی ہے تو میری بھوک ایکدم ختم ہو جاتی ہے۔" وہ آنکھیں بند کر کے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

"او...... اچھا...... دیدی" میں نے زیر لب کہا۔

اب ساری بات سمجھ میں آئی۔ تو میرے شہد رنگ نینوں والے شہزادے کو دیدی سے عشق ہو گیا ہے...... اس خیال کے آتے ہی میرا جی' دل کھول کر ہنسنے کو چاہ رہا تھا کہ میں سوچنے لگی کہ حالات کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھے۔ عاشق صاحب اپنے ساڑھے گیارہ برس کے ننھے سے دل کو انجانے میں دل کا روگ لگا بیٹھے تھے۔ اور فرقت کے تمام تر تقاضوں پر پورے اتر رہے ہیں اور اس سے پیدا شدہ کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دل میں اس حسینہ کو دیکھنے کا خیال زور پکڑنے لگا۔ مگر عاطف کی مسلسل اداسی سے رنجیدہ بھی ہوتی رہی۔

شام کو میں نے منصور کو ساری روداد سنائی تو وہ ہنس دیئے۔ مگر پھر میرے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات دیکھ کر سنجیدہ ہو گئے۔ اور کچھ سوچنے لگے۔

"اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بس ایک آدھ دن میں دیدی کو بھول بھال کر نارمل ہو جائیں گے۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہنے لگے۔

"وہ تو ہم سے بھی تیز نکلے۔" انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی مسکرا دی۔ حالانکہ ہم دونوں اندر سے کچھ کچھ اداس تھے۔

دو دن تو گزر ہی چکے تھے۔ تیسرا اور چوتھا بھی گزر گیا۔

مگر ان کی طبیعت بجھی سی ہی رہی۔ بیٹھے بیٹھے چھوٹے چھوٹے لبوں سے طویل آہ نکل جاتی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم جم جاتیں۔ چہرے پر پیلاہٹ چھا گئی تھی۔ میرے دل کے اندر سے ہوک سی اٹھنے لگی تھی۔ شکر ہے عتاب اس بارے میں کچھ جانتی نہیں تھیں ورنہ مذاق بن جاتا غریب کا۔ مجھے خیال آتا۔

کبھی کبھی میں یہ بھی سوچتی کہ ہفتہ بھر گذر گیا دیدار یار کو مگر اس سچے عاشق کی وارفتگی

میں کوئی فرق نہ آیا۔

عاطف آج کل بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ محبتوں کو رشتوں کے خانوں میں رکھنا وہ کیا جانتے۔ بس انہیں سوائے سوچتے رہنے کے اور کچھ سجھائی نہ دیتا۔ ادھر کچھ دنوں سے ان کا دوست ساحل بھی بیمار تھا اور سکول سے مسلسل ناغہ کر رہا تھا۔ عاطف اسے فون پر ہوم ورک وغیرہ سے آگاہ کرتے۔ پھر بھی کئی چیزیں رہ جاتیں۔

ایک دوپہر کو جب عاطف سوچتے سوچتے سو گئے تو دروازے کی گھنٹی بجی۔

دروازے میں لگی آتشی آنکھ سے دیکھا تو ایک بڑی سی ناک نظر آئی اور اس کے پیچھے ایک اجنبی لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں نے دروازے کے کنارے پر لگی زنجیر کو چوکھٹ میں پھنسا کر کھلنے دیا کہ مجھے لڑکی ٹھیک سے دکھائی بھی دے اور بات بھی ہو سکے۔ اور وہ اندر بھی نہ گھس سکے۔ کہ کون جانے بڑے شہر کی ایک لمبی دوپہر میں کون لٹیرا کس روپ میں آجائے۔ لڑکی سر سے پاؤں تک نظر آئی تو اچھے گھر کی معلوم ہوئی۔

"ہائے...... میں ساحل کی دیدی ہوں۔"

"تو یہ ہیں دیدی صاحبہ۔" میں نے مسکرا کر دروازہ کھول دیا۔

"میں معافی چاہتی ہوں۔ بغیر فون کیے آ گئی۔ بس کچھ جلدی میں بھی تھی اور ادھر سے میرا ٹیوشن کا جانے کا راستہ بھی تھا۔ پھر Sure بھی نہ تھی کہ وقت ملے گا کہ نہیں۔ میں نے ساحل سے وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ مگر کوشش تھی کہ اس کا کام نقل کرا لاؤں۔"

وہ سراپا مسکراہٹ ہی کچھ شرمندہ سی ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

"میں نے کچھ غلط کیا" اس نے مجھے بغور اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"تم نے بہت اچھا کیا۔ آؤ اندر آؤ۔" میں نے اس کا شانہ تھام کر کہا۔

وہ ایک ڈھلی ڈھلی سی سمارٹ لڑکی تھی۔ دبلی، دیا سلائی سی، سانولی رنگت۔ آنکھیں گہری کالی۔ بال لمبے لمبے جنھیں اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا اور وہ اس کے خاکی رنگ کے لمبے سے ٹاپ کے نچلے کنارے تک آتے تھے۔ اس کے ساتھ اس نے سیاہ ڈینم کی جینس پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں بغیر ایڑھی کے نوکیلے جوتے تھے۔ جب تک اس نے بات نہیں کی تھی مجھے وہ ایک عام سی نارمل لڑکی نظر آئی مگر جب وہ مسکراتے ہوئے، سوالیہ سی منتظر سی نظروں سے دیکھتی ہوئی بات کرنے لگی تو اس کی آواز کی کھنک اور مسکراہٹ سے پھول کی طرح کھل

جانے والے چہرے نے اس کے پر وقار رنگ کے لباس کے ساتھ میل کھا کر اسے ملکوتی حسن بخش دیا۔ اور اس دبلے پتلے خاموش سراپے کے ساتھ اس کی بولتے ہوئے چہرے نے ایک ذہین قسم کا تال میل پیدا کر دیا۔ لیکن اگر چہرے کے نقوش کو جدا جدا دیکھا جاتا تو کسی میں کوئی بات نظر نہیں آتی۔ چہرہ لمبا تھا اور آنکھیں خاصی چھوٹی کہ ٹھوڑی اور آنکھوں کے درمیان اچھا خاصہ فاصلہ ہو جاتا۔ ناک پھیلی ہوئی مگر نوکیلی تھی ہونٹ اتنے باریک کہ اوپری لب ایک حاشیہ سا نظر آتا تھا۔ مگر دانت سچّے موتیوں کے دانے جیسے نہایت متناسب قطار میں جڑے ہوئے تھے۔

عاطف میاں کو کیا بات بھا گئی تھی خدا جانے......

بہر حال یہ دل کا معاملہ تھا۔ اس میں میں کیا کر سکتی تھی۔

میں نے مصلحتاً عاطف کو بیدار کیے بغیر ان کی کاپیوں سے کچھ چیزیں نقل کروا دیں۔ وہ اس کے کمرے میں گئی اور نیند میں ان کا ماتھا چوم کر ایک چاکلیٹ ان کے سرہانے کے پاس رکھ دی۔

عاطف جاگے تو ہم نے بتایا کہ دیدی آئی تھیں اور اپنے بھیا کے لیے چاکلیٹ رکھ گئی ہیں۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ چہرے پر کئی رنگ آتے جاتے رہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے سر اٹھا کر ایک زخمی سی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

"دیدی آئیں اور آپ نے...... مجھے جگایا تک نہیں۔" ان کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔

"وہ چلی بھی گئیں......اور ......اور......" وہ بلک بلک کر رو پڑے۔

میرے دل میں دُکھ کی لہر سی اُٹھی۔ "انہوں نے بھی مجھے نہیں جگایا...... انہیں مجھ سے بات نہیں کرنی تھی؟" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگے۔

میں بے چین ہو اُٹھی۔

"کون سی بات بیٹا......" میں نے نہایت نرمی سے کہا۔

"وہ تو ساحل کا ہوم ورک لینے آئی تھیں۔ آپ کی نیند خراب کیے بغیر ہی انہوں نے آپ کے لیے چاکلیٹ رکھا اور چلی گئیں۔" میں نے سینے سے لگا کر نرم نرم گالوں پر ڈھلکتے موٹے موٹے آنسوؤں کو اُنگلی سے صاف کیا۔

وہ سر جھکا کر چاکلیٹ کو دیکھنے لگے۔ پھر اٹھ کر اسے اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا۔ حالانکہ یہ ان کے پسندیدہ چاکلیٹس میں سے ایک تھا۔ اور نیند سے بیدار ہونے پر انہیں بھوک بھی

لگی ہو گی۔

میرے اندر بے چارگی سی اتر آئی۔

اس طرح کوئی دس روز گزر گئے۔ اب منصور بھی پریشاں ہو گئے تھے کہ ان کی مسکراہٹیں کس طرح واپس لائی جائیں۔

دو روز بعد دسہرے کی چھٹیاں شروع ہوگئیں۔ ہم پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ منصور کا خیال تھا کہ وہاں عاطف کو نارمل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

دو ایک دن عاطف اِدھر اُدھر ٹہلا کیے۔ تیسرے دن ہمارے بغل والے سویٹ میں ایک اور کنبہ رہنے آیا۔ ان کے ہاں بھی ایک دیدی تھیں۔ کچھ ویسی ہی دبلی پتلی مگر عمر میں بڑی تھیں۔ بی اے کی طالبہ۔ ہوٹل کے باقی کمرے تقریباً خالی تھے اس لیے عاطف اور وہ کچھ کچھ دوست بن گئے۔ دیدی بھی ان کے بھولے مکھ پر کچھ ایسی ریجھ گئیں کہ انھیں اپنے ایک اہم راز سے واقف کر دیا۔ اور انہوں نے بھی رازداری کا حلف ایسا نبھایا کہ صرف مجھے بتادیا کہ ان کی دیدی کا بوائے فرینڈ آنے والا ہے۔

دیدی مال (Mall) پر بوائے فرینڈ سے ملنے گئیں تو یہ بھی ہمراہ تھے۔ لوٹے تو خاصے پُرسکون تھے اور بیچ بیچ میں کچھ سوچ بھی رہے تھے۔ مگر یہ سوچ ویسی اداسی لیے ہوئے نہیں تھی جو مجھے اُداس کر دیتی۔

دوسری صبح دیدی کو جانا تھا۔ بوائے فرینڈ نے دیدی کے ہاتھ عاطف کے لیے ایک خوبصورت سی کتاب بطور تحفہ بھیجی......

اگلے روز ہم بھی چلے آئے۔ عاطف نے گھر پہنچ کر اپنا سامان خود ان پیک (unpack) کیا۔ کمرہ ٹھیک کیا اور میرے پاس آگئے۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ میرا رُخ گیس کے چولہے کی طرف تھا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے بازو میرے گرد ڈال دیئے اور سر میری پیٹھ سے ٹکا دیا۔

"ماماں" وہ دھیرے سے بولے۔

"جی میرے بچے۔"

"کیا ساحل کی دیدی......" وہ سنجیدہ سے لہجے میں کچھ کہتے کہتے رکے...... میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"ساحل کی دیدی کا بھی کوئی بوائے فرینڈ ہوگا۔" انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا...... ہو سکتا ہے...... وہ بڑی ہیں نا۔"

"ہوٹل والی دیدی سے تو تین چار سال چھوٹی ہیں نہ۔"

"مگر آپ سے بھی تین چار سال بڑی ہیں نا۔"

"ہاں...... وہ تو ہے۔"

میں ان کی طرف پلٹی...... کچھ دو تین پل اِدھر اُدھر دیکھتے رہے پھر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف گئے۔

لوٹے تو ان کے ہاتھ میں وہ چاکلیٹ تھا جو انہوں نہ چھٹیوں سے پہلے اپنی لکھنے کی میز کی دراز میں سنبھال کر رکھا تھا۔ آدھا توڑ کر میرے منہ میں ڈال دیا اور باقی خود کھانے لگے۔

"شام کا اخبار آیا ہو گا نا" انہوں نے کہا اور میرا جواب سننے سے پہلے ہی اخبار کی تلاش میں اچھلتے کودتے باہر بالکنی کی طرف گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

□□

("استعارہ" دہلی، ۲۰۰۰)

مہمان

آخر بات سچ نکلی۔ سپنا کا دولہا واپس نہیں آیا۔ اس نے مہینے کی پہلی تاریخ کو لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔

کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے جب سپنا اسے مجھ سے ملوانے لائی تھی۔ تو میں حیران ہوگئی تھی۔ وہ اصل میں اس کا ہونے والا دولہا تھا۔ لیکن کہیں سے بھی سپنا کا دولہا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چھ فٹا جوان۔ گہری سانولی رنگت مگر جاذب نقوش اور ساتھ میں اسمارٹ بھی خاصا تھا۔ خود سپنا مختصر سی تھی۔ چھوٹا سا قد، دبلی پتلی سی۔ رنگ کچھ سانولا۔ نقوش کہیں کہیں سے تیکھے۔ نہایت غیر واضح سا جسم۔

زندگی میں پہلی دفع مجھے کوئی ذمہ دار گھریلو مددگار ملی تھی۔ جس نے بغیر میرا دماغ نوش کیے بس دو دن میں گھر کا کام سمجھ لیا تھا۔ بچّوں کی پسند، میاں کا مزاج، میری ضرورت۔ اس طرح کی اکثر عورتوں کی طرح اس نے کبھی اپنی مفلسی کا رونا رویا نہ قرضے کا دکھڑا سنایا۔ پیشگی تنخواہ بھی نہ مانگی۔ حالانکہ اس کا گھر میل بھر دور تھا اور بازار ختم ہو جانے کے بعد اسے ایک نیم سنسان پل کے نیچے سے گذرنا پڑتا تھا، جس وجہ سے کبھی دیر ہو جانے کی صورت میں اسے رکشے کے لیے کچھ دے دیا کرتی تھی۔ نہ بھی دیتی تب بھی شاید وہ اسی طرح خاموشی سے کام میں لگی رہتی۔ اور اندھیرا ہونے پر بھی خالی ہاتھ نکل پڑتی۔

سپنا کے آنے سے پہلے میرے پاس ایک ادھیڑ عمر عورت کام وام کیا کرتی تھی۔ مگر ادھر کچھ عرصہ سے وہ کچھ زیادہ ہی بیمار رہا کرتی اور اس کی جگہ اس کی پندرہ سالہ بیٹی سندری آجاتی جسے جھیلنا میرے لیے مرحلہ ہو جاتا کہ کبھی تو وہ بچّوں کی طرح معصوم نظر آتی کبھی فل فلیجڈ جوان لڑکی۔ کبھی ضدی، کبھی بھولی۔ جب مرضی ہوتی تو سارے کام خوش اسلوبی

سے انجام دیتی۔ اور اگر موڈ نہ ہو تو ایک کام پر آدھا دن لگا دیتی۔ گملوں میں جب پہلا گلاب کا پھول کھلا تو اس نے اسے توڑ کر بالوں میں لگالیا۔ میں نے چھت پر اسے پودوں کو پانی دینے کے لیے بھیجا تھا۔ گھنٹے بھر بعد اتری۔

''اتنی دیر لگادی'' میں نے اس کی سیاہ فام گردن پر بکھرے گھنگھریالے اور بھی زیادہ سیاہ بالوں میں لگا سرخ گلاب دیکھ کر بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''کیا کر رہی تھیں۔''

''پھول لگا رہی تھی جی بالوں میں۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے میں نے ہی اُسے اس کام کے لیے بھیجا ہو۔ مجھے اس کا جواب سن کر ہنسی آگئی۔ پھر پھول اس کے بالوں میں اچھا بھی لگ رہا تھا۔ دوسرا کھل جائے گا ایک آدھ دن میں...... میں نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ نہایت احتیاط سے پھول کا لمس ہاتھ سے محسوس کرتی ہوئی اٹھلاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چل دی اور میں اسے کئی جذبوں میں گھری دیکھتی رہ گئی۔ کبھی کبھی اس کے احمقانہ بھولے پن پر مجھے پیار سا آجاتا تھا۔

وہ ساؤتھ انڈین تھی۔ آبنوسی رنگت۔ بھرا بھرا جسم۔ بلکہ بھرنے کے پروسیس میں۔ بھرے بھرے لب و رخسار۔ بلّی کی آنکھوں کی طرح آڑھی سی آنکھیں۔ یعنی آنکھوں کے اندرونی کونے نتھوں کی طرف۔ اور باہری ماتھے کی طرف توے پر بنی روٹی جیسے گول چہرے پر گول گول چھوٹی سی ناک، سفید دانتوں کی متناسب قطار۔ چھوٹی سی چولی اور گل بوٹوں کی چھینٹ والے گھاگھرے کے درمیان کسی کسائی کمر۔ وہ اس عمر کی اکثر لڑکیوں کی طرح نازک تو نہیں تھی مگر جاذب ضرور تھی۔ عمر کی تبدیلیوں نے اور پڑوس کے نوکروں ڈرائیوروں کی نگاہوں نے اسے عجیب عجیب باتیں سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اس نے ان باتوں پر کچھ زیادہ ہی ری ایکٹ (React) کیا۔ اب وہ ہر وقت یا تو سوچتی تھی یا سمجھتی۔ اب وہ بازار کا کام خوب شوق سے کرتی تھی اور گھر کے کام اس سے ختم ہونے میں ہی نہ آتے تھے۔ کام شروع کرتی اور سنگھار میں مصروف ہو جاتی۔ کبھی گلے کی زنجیر کھول کر اس کی پازیبیں بنا رہی ہے کبھی ایک ہاتھ کی چوڑیاں دوسرے میں منتقل کر رہی ہے، اور کبھی دونوں ہاتھوں میں آدھی آدھی پہن رہی ہے یا پھر دونوں ہاتھوں سے ساری چوڑیاں اُتار رہی ہے۔ گھر میں سب سے زیادہ فون اسی کے آتے۔ پتہ نہیں کتنے بھائی تھے اُس کے۔ ویسے اُس کی ماں کے کوئی نرینہ

اولاد ہی نہیں تھی۔ کبھی کبھی میں کچھ جھنجھلا کر پوچھتی اس سے۔

"کس کا فون تھا سندری؟"

"وہ جی میرے بھائی کا تھا۔"

"ابھی ابھی تو کیا تھا تمہارے بھائی نے فون؟"

"وہ چاچا کا لڑکا تھا جی...... یہ تو ماما کا ہے...... آج ہی آیا ہے مدراس سے۔" وہ مُسکرا کر کہتی۔

"کل چھٹی ملے گی میم ساب۔" میں سوال کر کے اُسے چھٹی مانگنے کی آزادی دے بیٹھتی۔

"کیوں...... کل کیا ہے۔"

"ہے تو کچھ بھی نہیں...... پر اس کو...... اُس کے لیے کمرہ ڈھونڈنا ہے......"

"تو یہ کام تیری ماں کرے گی نا...... یا وہ خود...... تو تو بچّی ہے...... تو کیا کرے گی۔"

"بچّی کہاں ہوں جی...... میری بھی شادی ہونے والی ہے...... ماں کہتی ہے۔"

"کس سے کرے گی وہ تیری شادی۔"

"ماں کا بھائی ہے نا چھوٹا، وہ جو آتا ہے کبھی کبھی، وہ گندا سا جس کا چپل پھٹا ہوا ہے کاغذ جمع کرتا ہے نا وہی۔"

"تو کرے گی اس سے شادی؟" میں اُس کی باتیں دلچسپی سے سننے لگ جاتی۔

"ہاں جی اور کیا......"

"تجھے اچھا لگتا ہے وہ؟"

"نہیں جی...... وہ تو ایک دم میلا ہوتا ہے۔ نہاتا بھی بہت دن میں ہے۔ بیڑی پھونکتا ہے جب تب۔"

"تو پھر کیوں کرے گی اس کے ساتھ بیاہ تو؟"

"ماں جو کہتی ہے اسی لیے، پھر میں اُس کے ساتھ گاؤں جاؤں گی۔ مجھے تو یاد بھی نہیں ہے اب اپنا گاؤں۔ ماں کہتی ہے بہت سندر ہے۔ مجھے تو اپنا بھاشا بھول گیا ہے جی۔ ماں کہتی ہے گاؤں جا کر سب سیکھ لوں گی۔ پھر کچھ دن بعد واپس ادھر آجاؤں گی۔"

"اور تیرا دُلہا......"

"وہ وہیں رہے گا جی۔ مجھے کام کرنا ہوگا نا۔ وہ تو کچھ کرتا نہیں۔ میرا باپ بھی تو کچھ

نہیں کرتا نا۔ ماں کا پیسہ دارو میں پی جاتا ہے۔" وہ جھکی جھکی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی آہستہ سے بولتی رہی۔

اپنی تمام بیوقوفیوں کے باوجود وہ ذہنی طور پر اپنے اس طے شدہ مستقبل کے بارے میں آگاہ تھی۔ اور اس نے اِسے قبول بھی کر لیا تھا۔ اس کی طرف کی اکثر کام کرنے والی عورتوں کے شوہر کچھ نکمے واقع ہوئے تھے۔ عورتیں لوگوں کے گھروں میں کام کرتیں۔ اور مرد اپنے گھروں میں بچے کھلاتے۔ شام کو جب عورتیں گھر کو لوٹتیں تو یہ پینے ویئے نکل جاتے۔

ان کے ہاں ماموں بھانجی اور خالہ بھانجے کی آپس میں شادیاں ہوا کرتی ہیں۔

دوسرے دن سُندری شام تک آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ مگر وہ تیسرے دن بھی نہ آئی۔ گو کہ وہ کام کم اور پریشان زیادہ کرتی تھی مگر پھر بھی مجھے اس کا انتظار رہا۔ چوتھے دن اس کی پڑوسن نے آکر بتایا کہ اب وہ کام نہیں کرے گی کہ اس کی ماں اتوار کو اس کا بیاہ کر رہی ہے۔ اور یہ بھی کہ مدراس سے آنے والے لڑکے سے ملنے کے بعد سُندری نے ماں کے بھائی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو سُندری کو گھر میں بند کر دیا گیا اور اس لڑکے کی مار پیٹ کی گئی۔ مگر لڑکا چونکہ پھر بھی گھر کے آس پاس منڈلاتا دکھائی دیتا ہے اس لیے سندری کی ماں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے بھائی سے فوراً اس کا بیاہ کر کے دونوں کو گاؤں روانہ کر دے گی اور اس کام سے نبٹنے کے بعد خود کام پر آئے گی تب تک آپ اس لڑکی کو رکھ لیجئے۔ اس کی پڑوسن نے اپنے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"یہ کون ہے" میں نے لڑکی کا بے تاثر چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

"یہ سپنا ہے۔ کچھ دن پہلے کلکتہ سے آئی ہے۔ اب اِدھر ہی رہے گی۔ اگر آپ چاہیں تو یہاں ہی رہ جائے گی۔"

تو یوں سپنا میرے گھر آ گئی۔ سپنا کے والد کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔

اس کی جوان جہان ماں کا اس کے نانا، نانی نے دوسرا بیاہ کرنا مناسب سمجھا۔ ماں اپنی نئی سسرال چلی گئی۔ اور سپنا ننھیال میں پلنے لگی۔ اس کی ماں کے جب کئی چھوٹے چھوٹے بچے پیدا ہو گئے تو اس نے سپنا کو کلکتہ سے بلوا لیا کہ ماں کا گھروں میں کام کرنا، بے تحاشا بچے پیدا کرنا اور پالنا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لیے اسے سپنا کی مدد کی ضرورت تھی۔ پھر سپنا

اب سیانی بھی ہو گئی تھی اور اپنا خیال خود رکھ سکتی تھی۔ یہ باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔

سپنا میرے گھر آنے لگی تھی۔ اس کا سلیقہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ چیزوں کو نکھارنے سنوارنے میں اس کا جواب نہ تھا۔ پھرتیلی، خاموش طبع، اپنے کام سے کام رکھنے والی صاف ستھری سی، گھر سے نکل کر مندر سے ہو کر میرے ہاں آنے والی۔ ہر پیر کو بھگوان شو کا ورت رکھنے والی۔ میں نے گھر اُسے سونپا تو زندگی پُرسکون ہو گئی۔ گھر، بازار سب سنبھال لیا تھا اس نے۔ پھل والے، سبزی والے کو نبٹاتی۔ فون اٹینڈ کرتی۔ اشارے سے سمجھ لیتی کہ صاحب گھر میں ہو کر بھی گھر میں ہیں کہ نہیں۔ دروازہ کس پر کھولنا ہے اور کس کو دروازے میں لگی محدب آنکھ سے دیکھ کر بھی نہیں دیکھنا ہے۔ سابقہ مادر و دختر کی زخم خوردہ میں، سپنا سے کس قدر مطمئن تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کا کام دیکھ کر زبان سے دعائیں نکل جاتیں۔ وہ شام کو جاتی تو ہر چیز ایسے سنوار کر کہ مجھے بس برائے نام ہی کچھ کرنا پڑتا۔

میری دعائیں۔ اس کی ماں کی چنتا، کہ اُس کی شو بھگتی، ایک اچھے لڑکے نے اسے پسند کر لیا۔

"میرے کو لگتا ہے میم صاب کہ میرا سادی (شادی) اسی کے ساتھ ہو گا۔" جس دن اسے لڑکا دیکھنے آیا تھا اس نے دوسرے دن آکر کہا۔ اس سے پہلے اسے ایک دو لڑکے دیکھ گئے تھے مگر ان کی طرف سے پھر کوئی جواب نہ آیا تھا۔ جیسے انسان نہ ہو کوئی چیز ہو۔ پھر ان کے بارے میں اس نے کچھ کہا بھی نہ تھا۔ بس ایک ایک دن کی چھٹی لے لی تھی۔

"وہ کیسے؟" میں نے اس کی اس بات کی سادگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوچھا۔

"وہ میرے ہی جیسا ہے...... میرے سے بھی زیادہ کالا ہے۔ پہلے والے دونوں گولے (گورے) تھے۔ پھر اس کا ناک نقشہ بھی میرے ہی جیسا ہے۔"

کبھی کبھی جیسے اس کی زبان پھسل جاتی۔ کئی باتیں تتلا کر کرتی۔

"اس نے پھوٹو (فوٹو) منگوایا ہے۔ اُس نے پیغام بھجوایا ہے کہ سادی (شادی) جلدی ہو گی۔ مگر میری ماں کے پاس پیسہ نہیں ہے۔"

ایک دن صبح آتے ہی بولی تھی۔ جیسے میں اس کی کوئی قریبی رشتہ دار تھی۔ سب باتیں کہہ ڈالتی۔ اور یہ باتیں بتانے کی اس کو نہایت جلدی ہوتی۔

دراصل بچپن تو اس نے ننھیال میں گذارا تھا۔ اور ادھر ماں نئے شوہر و بچوں میں ایسی

مشغول ہوئی کہ اسے تقریباً بھول ہی گئی۔اس کی ضرورت تھی، شاید اسی لیے اسے بلوانے کا زیادہ خیال آیا ہو۔

''آپ سوچتے ہوئیں گے کہ میں ساری بات آپ سے کیوں کرتی ہوں۔'' وہ مختلف جگہوں سے سیکھی ہوئی ہندوستانی خاصے اعتماد سے بولتی ہوئی کہنے لگی۔

''ہاں سوچتی ہوں۔ مگر مجھے اچھی لگتی ہیں تمہاری باتیں۔''

''پھر کس سے کروں...... بات...... ماں سے تو سرم (شرم) آتی ہے مجھ کو...... سچی بتاؤں...... میں ادھر نانی سے سب بات کرتی تھی...... ماں تو کبھی پاس تھی ہی نہیں...... جب بڑی ہوئی نا...... '' وہ کچھ کہتے کہتے رکی...... اور کھل کھلا کر ہنس دی...... ''جب بڑی ہوئی نہ میں ...... میرے کو کچھ پتہ تھی (تھا) نہیں...... '' دراصل اس طرح کے الفاظ کے لیے بنگلہ زبان میں تذکیر و تانیث ہوتی بھی نہیں۔

''بابارے میں تو ڈر گئی تھی کہ یہ کیا ہو گئی...... نانی نے سمجھائی تھی سب بات...... ایسا ہوتا ہے لڑکی لوگ کو بتایا۔'' وہ پھر ہنس دی اور بولی۔

''مگر پھر بھی میں جھجکتی ...... نانی اتنی بوڑھی...... کوئی میری سہیلی تو تھی نہیں۔'' وہ سنجیدہ ہو گئی......

''پھر ماں تو نانی بھی نہیں۔ ماں سے میں بات کیا کر سکتی ہوں۔''

جب تب بولتی ہے ''سپنا راجو کو روٹی کھلادے۔ اجے جو کو گودی میں لے لے۔ سبزی کتر۔ یہ کر وہ کر۔''

اس کی آواز بجھ سی گئی۔ ''کبھی پیار تو کیا نہیں مجھے۔ باقی سب کو گلے لگا کر پیار کرتی ہے۔''

''تو...... تو بڑی ہے نا...... تجھے تو من میں پیار کرتی ہے۔ تجھے گودی میں لے کر منہ تھوڑی چومے گی۔'' میں نے مسکرا کر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔

''پھر بھی کبھی کہتی کہ تجھے کچھ چاہیے تو نہیں؟'' اس نے دور دیوار کی طرف دیکھ کر کہا جہاں سے باہر کی طرف اُگے ہوئے درخت کی شاخیں اس طرف جھانک رہی تھی۔ جس کے بارے میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ دیوار درخت کے سہارے کھڑی ہے یا یہ درخت دیوار کا سہارا لیے استادہ ہے۔

"ارے پگلی اس نے تو سارا گھر تیرے حوالے کر رکھا ہے۔ تو اس کی اولاد ہے۔ اُس گھر کی مالک ہے۔ تجھے کیا پوچھے گی وہ۔ تجھے منع بھی تو نہیں کرتی کسی چیز سے......؟"

"ہاں وہ تو ہے......" وہ آہستہ سے بولی۔

"تو پھر......اچھا چھوڑ یہ باتیں اور بتا کہ شادی کب ہو رہی ہے۔ اب تو لڑکا بھی جلدی شادی کرنا چاہتا ہے نا......"

وہ کچھ شرمائی...... پھر ہنس دی۔ معصوم سی ہنسی ہنسا کرتی تھی وہ۔ جیسے چار پانچ سالہ بچّی ہنس رہی ہو۔ جب پکارے جانے پر واپس صدا دیتی تو نہایت نازک سی آواز میں "جی" کہتی۔ جیسے کسی بچّے سے کھیل رہی ہو اور اسے خوش کرنے کے لیے 'جی' کہہ رہی ہو۔ مگر دور سے آتی ہوئی اس کی 'جی' میرے اندر کچھ عجیب سا تاثر پیدا کر دیتی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ سخت مظلومیت کے عالم میں 'جی' کہنے پر مجبور ہو اور میں خوامخواہ جیسے کسی نابالغ بچّی سے محنت کروا رہی ہوں۔ مگر اس کے سامنے آتے ہی مجھے اپنی غلط فہمی کا احساس ہونے لگتا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آتا کہ بالغ چہرے کے ساتھ غیر مناسب سی آواز مل گئی ہے۔ پھر ایسا بھی نہیں تھا۔ کہ یہ تاثر اس کی آواز کی ہی وجہ سے پیدا ہو رہا ہو بلکہ اس کا سراپا ہی ایسا تھا کہ دل میں 'رحم'، 'محبت'، 'ہمدردی' اور نہ جانے کون کون سے جذبے بہ یک وقت بیدار ہونے لگتے۔ اور جب کبھی وہ 'آرہی' کی جگہ 'آلہی' کہہ دیتی تو میرے اوٹ پٹانگ خیالات کی تصدیق ہونے لگتی۔ اور مجھے اس کے سراپے میں اور بھی بہت سی غلطیاں دکھائی دینے لگتیں۔ اس کے چھوٹے سے سانولے چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں ایسی معلوم ہوتیں جیسے وہ چہرے پر نہ ہو کر چہرے کے کناروں کے ساتھ کہیں سے اڑتی ہوئی آ لگی ہوں۔ پتلی سی ناک اور باریک لبوں کے نیچے ٹھڈی برائے نام تھی۔ اور اس تکونے چہرے کے ساتھ مہین سی گردن کے کچھ زیادہ ہی پاس سے شروع ہونے والے' نیچے کی طرف زاویہ قائمہ بناتے ہوئے بغیر چربی والے شانوں پر دگنا چگنا کیا ہوا دوپٹہ جیسے یوں ہی رکھ دیا گیا ہو کہ وہاں دوپٹہ اوڑھنے کا کوئی جواز قطعی عیاں نہ تھا۔ ساری غلط ملط سی پچوویشن میں ایک غلط ملط سچی بات یہ بھی تھی اس میں کچھ ایسا سلیقہ تھا جیسے اس نے باقاعدہ ہوم سائنس میں کوئی ڈگری لی ہو' انٹیریر ڈیکوریشن میں ڈپلومہ یافتہ ہو یا کسی فائیو سٹار ہوٹل میں بٹلر کی ٹریننگ کی ہو۔

"تم نے یہ گھر کا کام کرنا کہاں سے سیکھا ہے" کبھی کبھی میں اپنی آواز کی حیرت کو نہایت

مہارت سے پوشیدہ رکھ کر کہتی۔

"نانی کے گھر میں ہی تو کیا کرتی تھی سب کام۔ نانی تو صرف مُر گیاں (مرغیاں) سمبھالتی۔ انڈے جمع کرتی۔ کچھ بیچتی کچھ مرگیوں کے نیچے رکھتی۔ یہ ہی بس سارا دن کرتی ورنہ پَروس میں بات کرتی۔ نانی تو کچھو نہیں سکھائی۔ میں تو خود ہی کرتی تھی سارا کام...... پھر میں تو آپ سے سیکھی ہوں باقی سب۔"

"مجھ سے......؟؟" میں نے بھی کوئی اس طرح نہیں سکھایا اسے کہ باقاعدہ سکھانا کہا جا سکے۔ بس جو ذرا صحیح نہ لگا بتلا دیا...... تو اتنے میں ہی......؟ میں سوچنے لگتی...... غالباً خانہ داری بھی ایک خداداد تحفہ ہے جو دیگر فنون کی طرح کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ میں سوچتی رہ جاتی۔

"ماں کہتی ہے کہ راجو کا پیسا ملے گا تو سادی کا تاریکھ (تاریخ) نکالیں گے۔" وہ مٹر کی پھلیوں میں سے دانے نکالتی ہوئی اوپر دیکھے بغیر بولی۔

"راجو کے کون سے پیسے۔ وہ کام بھی کرتا ہے کیا، اتنا چھوٹا سا؟"

"نہیں کام نہیں کرتا۔ پچھلے سال اس کا ایک ٹرک والے نے گھٹنا جکھمی (زخمی) کر دیا تھا۔ چلتا تو ٹھیک ہے پر لنگراتا ہے۔ وکیل بولا کہ اگلے مہینے ملے گا روپیہ۔ پچیس ہجار (ہزار)۔ ماں دھوم دھام سے سادی کرے گی۔ دس ہجار (ہزار) راجو کے نام بینک میں جمع کرے گی۔ پانچ ہمارے گھر کا سامان میں اور جُھگی کا چھت میں لگے گا۔ ٹوٹا پڑا ہے ہمار جُھگی کا چھت۔ اور باقی کا دس ہجار (ہزار) میں میرا دہیج، سادی۔ سب کو بلائے گی۔" اس کے ہاتھ مٹر چھنتے چھنتے ٹھہر جاتے ہیں۔ آنکھیں مٹر کے دانوں میں خواب کھوجنے لگتی ہیں۔

پھر کچھ دن بعد پتہ چلا کہ لڑکا سپنا کے گھر رہنے چلا آیا ہے۔ میں کچھ حیران ہوئی۔ "شادی تو ہوئی نہیں۔ ابھی سے کیوں؟"

"اس کا دوست لوگ گاؤں گیا ہے۔ اب وہ کمرے کا کرایہ اکیلے ہی...... ماں نے کہا ہمارے ہاں آجائے۔ سادی تو ہونے والا ہے۔" اس نے بتایا۔

"پھر؟" جانے میں نے اس 'پھر' سے کیا پوچھنا چاہا تھا۔

"ماں اور باپو باہر سوتے ہیں۔ بچہ لوگ میں۔"

وہ کچھ دیر رُکی۔

"میں بچہ لوگ اور مہمان...... ہمارے ہاں داماد کو مہمان بولتے ہیں۔ ہم سب لوگ گھر

میں...... مہمان دوسرے کونے میں سوتا ہے۔" وہ شرمائی ہوئی سی ہنسی ہنس دی۔

ایک روز جب حسب معمول وہ صبح آئی تو آخری زینے پر رک کر پیچھے دیکھنے لگی۔

"آؤ۔ کھلا ہے دروازہ" میں نے اسے دیکھ کر کہا۔

"وہ مہمان بھی آیا ہے...... " وہ زینے کی طرف بدستور دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ سے ملنے...... " اس نے مجھے دیکھ کر نظریں جھکالیں۔

"آلہا ہے (آرہا ہے)" اس نے کہا تو مجھے یکلخت محسوس ہوا جیسے اس پر بال وواہ کا ظلم ہونے جارہا ہے۔ دوسرے لمحے ہی میں نے سر جھٹک دیا۔ اور تیسرے لمحے مہمان کو دیکھ کر میں متحیر رہ گئی۔ تقریباً چھے فٹ کا قد۔ اسمارٹ مسکراتا ہوا۔ شرمیلا سا نوجوان۔

یہ چھے فٹا جوان اور یہ توتلی سی؟ مگر کافی بھروسہ ہوگا اس کے والدین کو اس پر جو گھر میں رہنے کی دعوت دے دی گئی۔ میں سوچنے لگی۔

"پاؤں چھوئیے نا" سپنا نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے پہلو میں اپنی جیومیٹری بکس کے ڈیوائڈر (Divider) جیسی کہنی سے ٹھوکا دے کر آہستہ سے کہا۔

"نہیں نہیں بس۔ کیا کام کرتے ہو۔"

"ڈریول ہے میم ساب" سپنا نے باورچی خانے کے اندر سے آواز لگائی تو مہمان اور میں دنوں ہنس پڑے۔

سپنا نے اس کے لیے گاڑھی اور میٹھی چائے بنائی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر کچھ نوٹ رکھے اور کئی باتیں سوچتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

"تم لوگ اس کا گھر ور تو جانتے ہو نا۔" اس کے جانے کے بعد میں نے سپنا سے پوچھا

"چاچا جانتا ہے۔"

"کون چاچا...... تمہارا چاچا بھی ہے کیا۔"

"بابا کا دوست ہے۔ اسی کے گاؤں کا ہے۔ اسی نے تو لایا تھا رشتہ۔"

"لڑکا کہاں رہتا ہے۔"

"پتہ نہیں ...... بابا کو تو بوالا ہوگا۔ بوالا ہوگا تبھی نا گھر میں رکھا ہے۔"

"تم بہت اچھی لڑکی ہو...... مگر دنیا خراب بھی ہے ...... بہت خراب۔

تم...... اپنا دھیان رکھنا...... گھر میں ایسے رہنا کہ اس کی نظروں میں تمہاری عزت اور

بڑھے۔ تم سمجھتی ہو نا۔ پھر کسی کا کیا بھروسہ۔"

"جی ہاں...... مگر وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے" وہ مجھے دیکھ کر بولی۔

"ہاں وہ تو ہے...... مگر پھر بھی......"

"ہاں جی...... وہ تو ٹھیک بولے آپ۔ مگر وہ سب سے الگ لڑکا ہے۔"

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ اس نے اسے دل سے اپنا شوہر مان لیا ہے...... مجھے اس کی فکر سی ہو گئی تھی......

پھر کچھ دن بعد سپنا چپ سی رہنے لگی تھی۔ میں پوچھتی تو کہتی سب ٹھیک ہے۔ شاید اسے اپنی خاموشی کا خود بھی احساس نہ تھا۔

"تم آجکل سوچتی کیا رہتی ہو؟"

"کچھ نہیں سوچتی میم ساب۔"

"پھر چمچ کیوں بھول گئی...... شکر دان میں رکھا اور پیالی میں نہیں۔"

"پتہ نہیں کیا کیا سوچتی ہوں" وہ میز پر لگے چمکتے ہوئے گول کانچ کا کنارہ انگلی سے پونچھتے ہوئے بولی۔

"بتاؤ نہ......" میں نے انگلی سے اس کا گال چھو کر پیار سے پوچھا۔

"وہ جائے گا...... گاؤں...... لاسن رنیو (Lisence renew) کرانے۔"

"اس کی آنکھیں پتہ نہیں کب بھر آئی تھیں۔ وہ آنکھیں جھکائے میز کے کنارے کو دیکھ رہی تھی تو مجھے علم ہی نہ ہو سکا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکیں تو اس کے پتلے رخسار کے ذرا سے موٹے ابھرے ہوئے حصے پر، جولائی کے بارش کے قطرے سا ایک آنسو آ ٹکا۔

"ارے...... ایسے نہیں...... روتے نہیں نا......" میں کھڑی ہو کر اس کا سر سہلانے لگی...... "تم...... تم ٹھیک ہو نا......؟...... مگر تم تو بہت پیاری، بہت سمجھدار لڑکی ہو......"

میرے اندر سے حوا کی شکی 'مزاج بیٹی نے سوال کیا۔

"آپ بھی...... میم ساب" وہ روتے روتے کھلکھلا کر ہنس پڑی تو مجھے اپنی ہی بات عجیب معلوم ہوئی اور میں نے اس کی ہنسی میں اپنی کھسیانی سی مسکراہٹ شامل کر دی۔

پھر پتہ نہیں مہمان کب گاؤں روانہ ہوا...... ہاں اتنا ضرور ہوا۔ کہ اس دن سپنا نے سارا وقت کچھ بھی کھایا، نہ چائے پی، جس کی وہ شوقین تھی۔ اداس اداس سی کام کرتی رہی۔

"تم تو ایسے اداس ہو جیسے تمہارا میاں تمہاری سوت لے آیا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میری بات سن کر اس کے ہونٹوں پر پل بھر کو ہنسی جیسی کوئی شے نمودار ہوئی۔ اور پھر ایک بیمار سی مسکراہٹ میں بدل گئی...... اس کے بعد میں نے سپنا کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب بھی بات کرتی اسی کی کرتی۔

"آج دو دِن ہو گیا...... چٹھی نہیں آیا۔"

"ارے بھئی...... تین دن میں تو وہ پہنچے گا...... ویسے نام کیا ہے اس کا۔"

"دو تین نام ہے اس کا۔ کوئی بابو بولتا ہے...... چاچا شام بلاتا ہے...... دوست لوگ مُنا کہتے ہیں۔"

"اور اصلی نام کیا ہے؟"

"پتہ نہیں...... لاسن (لائسینس) پر لکھا ہے۔"

"کسی نے پڑھا نہیں......؟"

"کسی کو پڑھنا نہیں آتا...... چاچا بھی بہت دن سے گاؤں گیا ہے۔"

"اور گاؤں کا پتہ......؟"

"پتہ لکھ کر گیا ہے بے چارہ" وہ آہ بھر کر بولی "جانے سے پہلے مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا تھا۔"

"اچھا کل لے آنا...... ہم خط لکھیں گے۔"

"وہ بولا چٹھی لکھوں گا...... تو تم بھی لکھنا...... پہلے مت لکھنا۔"

"آنے کا کیا کہا؟"

"ایک مہینے میں آئے گا...... پہلا تاریکھ کو...... اس کو کام بھی ڈھونڈنا ہے نا......"

"اس کا ساب امریکہ چلا گیا ہے نا...... آپ رکھ لینا میم ساب، بے چارہ کا پریسانی دور ہو جائے گا......" وہ خالص ممتا بھرے لہجے میں بولی۔

"چٹھی لکھے گا تو پڑھے گا کون۔ پہلے یہ تو بتا...... بڑی آئی نانی اماں۔" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ......" وہ پل بھر کو شرمائی...... پھر اپنی اداسی کو واپس اوڑھ کر اس نے سر جھکا دیا اور ایک لمبی آہ بھر کر اپنی چہرے کی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بڑی آنکھیں اس نے فرش پر ٹھہرا دیں اور کسی سوچ میں گم ہوئی۔

"مجھے پیسہ دے کر گیا ہے، سوموارون کو جل چڑھانے کے بعد پھل میوا خریدا کروں۔"
اس نے اس حسرت ناک لہجے میں کہا۔

دن گذرتے گذرتے مہینہ ختم ہو گیا۔ سپنا کی چٹھی نہیں آئی۔

"اگر میں کل نہیں آئی تو آپ کسی کو صفائی برتن کرنے بلوا لینا۔" مہینہ بھر رونے اور اداس رہنے کے آخری دن وہ گھر جاتے وقت چہرے پر مہین سی چمک لیے ہوئے بولی۔ میں نے مسکرا کر حامی بھر لی۔ میں اس کا مطلب سمجھتی تھی کہ جب مہمان آئے گا تو اسے دن بھر کی چھٹی تو چاہیے ہی۔

کوئی تین دن وہ ہر شام یہ کہہ کر گئی۔ بجھے ہوئے چہرے پر بڑی بڑی روشن آنکھیں لیے ہوئے وہ چلی جاتی اور دوسری صبح خاموش سی آکر کام میں لگ جاتی، بیمار بیمار سی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے گہرے دائرے نظر آنے لگے تھے...... آج تین تاریخ تھی...... اور سپنا آج بھی آئی تھی۔ عجیب سی اعتماد بھری اداسی میں غرق اپنے کام میں مگن۔ خود سے بے خبر مگر اپنے فرض سے ہر حال میں خبردار۔ خود مجھے اس بانکے لڑکے پر تقریباً ہمیشہ ہی شک رہا کہ اس مدقوق سی لڑکی کا وہ ہو بھی پائے گا یا نہیں۔ اس عمر کے اکثر لڑکوں کی طرح اسے اس کی سیرت کی تو پرواہ ہو گی ہی نہیں۔

ان دنوں سپنا کا رنگ کچھ زیادہ ہی سنولا گیا تھا۔ ایک دوپہر کو وہ گھٹنوں پر ٹھڈی ٹکائے اپنے پیروں کو گھورتی ہوئی جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہی تھی۔

"اسے خط لکھیں؟" میں نے قریب جا کر پوچھا۔

"بولے گا سک (شک) کرتی ہے۔"

"تو پھر پتہ کیسے چلے گا......"

"ابھی اس کا کام پورا نہیں ہوا ہو گا...... پتہ نہیں کچھ کھاتا بھی ہو گا یا نہیں" وہ رو پڑی۔

"اری دیوانی...... وہ گھر گیا ہے اپنے...... گھر والے بھوکا رکھیں گے اسے کیا......؟

"اور سن وہ خوب کھاتا پیتا ہو گا...... تو ہی خود کو ہلکان کیے دے رہی ہے۔ سمجھیں؟"

"اس کا ایک ایک بات یاد آتا ہے...... وہ نہیں یاد کرتا ہو گا میرے کو......؟"

"ضرور کرتا ہو گا...... مگر کھاتا پیتا بھی ہو گا۔ اور پھر۔ تجھے یاد بھی کرتا ہو گا۔"

"سچ میم ساب؟" وہ ایکدم میرے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔

''اور کیا...... تو خوش رہ اور پرارتھنا کر...... تیرا ہو گا تو لوٹ آئے گا۔''

''میرا ہی ہے...... مگر ماں کہتی ہے...... کہ پتہ نہیں......'' اس نے ایکدم سے سر جھکا لیا۔

''تجھے وشواس ہے نا تو تیرا وشواس ٹوٹے گا نہیں...... ایسے خود کو کمزور کر دے گی تو وہ آکر کہے گا کہ سپنا کی کوئی بڑی بہن ہے......'' میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو اس نے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھیر دی۔ وہ اس دن کچھ زیادہ ہی کمزور اور تھکی تھکی نظر آرہی تھی۔ چھوا تو پتہ چلا کہ بخار بھی ہے۔ میں نے ایک دوا کی گولی کھلا کر اور دو ساتھ دیکر گھر روانہ کر دیا۔

دوسرے دن سپنا نہیں آئی۔ کہیں زیادہ بیمار نہ ہو۔ یا شاید اس کا مہمان آگیا ہو...... خدا جانے...... بیمار ہو گی...... شاید...... یا...... میں نے ایک عارضی کام والی کا بندوبست کیا۔

''آپ کی کام والی نہیں آئی نا آج۔'' وہ عورت بولی۔

''بیمار ہے...... تم جانتی ہو؟''

''اب تو وہ بیمار ہی رہے گی...... اُدھر ہی تو رہتی ہے ہمارے پاس میں ذرا سا دور۔ اب تو دیکھنا بی جی...... وہ بیمار ہی ہوتی رہے گی بیچاری۔''

''کیوں بھئی'' میں نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا۔

''جوان لڑکا بغیر شادی کے گھر میں رہ کر چلا گیا...... شکل سے ہی لفنگا لگتا تھا...... اب کہاں آئے گا...... پتہ نہیں کیا ہوا بے چاری کے ساتھ...... ادھر تو سب لوگ اس کی ماں کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ باپ تو چلو سوتیلا ہے...... وہ تو سگی ہے...... ایسے کوئی کرتا ہے...... شادی سے پہلے ہی گھر میں داماد بنا کر ڈال دیا۔'' وہ برتن کھڑ کھڑاتی ہوئی بولی۔

''اس طرح پٹخ پٹخ کر دھوؤ گی تو لکیریں نہیں پڑ جائیں گی برتنوں پر۔'' میں نے اُسے ڈانٹا۔

مگر اس کی باتیں سن کر میں کچھ ہی دیر میں خود بھی سوچوں میں غرق ہو گئی۔ میری طبیعت مضمحل سی ہو گئی۔ مجھے اپنا آپ بیمار محسوس ہونے لگا۔ کبھی کبھی میں پُر امید ہو جاتی۔ کہ قدرت اس پر ایسا ظلم نہیں ہونے دے گی۔

وہ عورت کام کر کے جا چکی تھی۔ اور میں نے بہ مشکل اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کیا۔ کہ میرا بس ایک جگہ پڑے رہنے کو جی چاہ رہا تھا...... میں دروازہ کی طرف سے پلٹی ہی تھی کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ سوچنے لگی کہ آنے والے نے گھنٹی کیوں نہیں بجائی۔ دروازہ کھولا تو

دیکھا کہ سپنا کا چھوٹا سا بھائی جس کا ہاتھ گھنٹی تک نہ پہنچ پاتا تھا' سامنے کھڑا تھا۔

"دیدی پرسوں آئے گی۔"

"بیمار ہے؟"

"کل رات مہمان آیا ہے نا...... دو دن چھٹی کرے گی۔"

میرے اندر مسکراہٹیں پھوٹ پڑیں...... اچھا لڑکا ہے۔ گنوں کی پہچان ہے اس کو...... میں اپنے آپ سے کہتی ہوئی ڈائننگ ٹیبل تک گئی اور وہاں ٹوکری میں سے ایک سیب اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے...... کوئی بات نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"بائے" اس نے چھوٹا سا ہاتھ ہلایا اور ایک ایک زینے پر باری باری دونوں پاؤں رکھتا ہوا چلا گیا۔

سالنامہ صریر۔ کراچی
۲۰۰۰

□□

باپ

باپ پرانی ادھ ٹوٹی ٹائیلوں والا بر آمدہ طے کر رہا تھا۔ ٹائیلوں کا رنگ زرد تھا، ان کی چمک غائب ہو چکی تھی۔ اور قدم پڑنے سے وہ آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ اور کچھ باپ کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے لڑکھڑا نہ رہا ہو بلکہ جان بوجھ کر قدم ایسے اٹھا رہا ہو جس سے چاپ سنائی دے، غیر متوازن ہی سہی۔

باپ کے ہاتھ میں اخبار میں لپٹا ہوا ایک بنڈل تھا۔ جس کی دونوں اطراف کوئی سرخ رنگ کی گول گول موڑی ہوئی چیز نظر آ رہی تھی۔ شاید کوئی کپڑا تھا۔

نہایت مختصر سے صحن کے ایک طرف لگے ہوئے نل کے پاس برتن دھو رہی ناظمہ نے ادھ منجھی تھالی نل کی چوبدی پر رکھ دی اور نل کی گردن کا سہارا لیکر کھڑی ہو گئی۔ اپنے نیم لاغر وجود کو اس نے صحن کی دیوار سے ٹکا دیا۔ دیوار سے کچھ مٹی بھر بھرا کر اس کے پیروں کی ایڑھیوں کے پاس جمع ہو گئی۔ باپ کے ہاتھوں میں سرخ بنڈل دیکھ کر اس کی بجھے دیئے جیسی آنکھوں میں مہین سی چمک لہرا گئی۔ سرخ بنڈل کوئی گرم کپڑا معلوم ہوتا تھا۔

اس موسم میں ایک شال سے بڑھ کر کیا چیز آرام دے سکتی تھی۔ گو کہ ابھی سردیوں نے شدت نہیں پکڑی تھی۔ مگر ٹھنڈے پانی سے اس کے پیلے پیلے ہاتھ گلابی ہو گئے تھے۔ دو دن سے وہ سکول بھی نہیں گئی تھی کہ اس کے اکلوتے سویٹر کی کہنیاں گھستے گھستے کلائیوں تک آ گئی تھیں اور آستینیں کیلے کے چھلکے کی طرح لگتی تھیں۔

ناظمہ ہفتے میں دو یا تین دن ہی سکول جا پاتی۔ وہاں سرزنش ہوتی، وہ گردن جھکائے کھڑی خاموش سنا کرتی۔ ایک پیر کی انگلیوں سے دوسرے پیر کی انگلیوں کو رگڑتی ہوئی۔ چور نظروں سے ہم جماعتوں کو دیکھتی ہوئی۔ جیسے اس نے اپنے چھوٹے سے وجود میں بڑے

بڑے اسرار چھپا رکھے ہوں۔

اسے گھر بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ کچھ سلائی بھی کرنا پڑتی تھی۔ اس کا اپنا اختیار ہوتا تو اسکول جانا چھوڑ ہی دیتی۔ اس کے پاس پڑھنے کے لیے نہ وقت بچتا تھا نہ اسے اس طرح کا ذہنی سکون میسر تھا جو طالب علموں کے پڑھنے کا متحرک بن سکے۔ اس کی کوئی سہیلی تھی نہ اس کا کسی سے کسی مضمون میں مقابلہ یا شوق۔ وہ تو بس اپنی امی کے کہنے سے سکول چلی جاتی کبھی کبھی۔

امی روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ ابھی سال بھر پہلے خاصی تندرست اور جاذب تھیں۔ مگر باپ نے ایک دن ایسا مار اپیٹا کہ بہت دن تک بستر سے ہل نہ سکیں۔ اندرونی اعضا میں چوٹ لگی تھی انھیں کہیں۔ غذا سیال کی شکل میں چمچ سے منہ میں ڈالی جاتی۔ ہفتہ بھر بعد ناظمہ کو پاس بلا کر اس کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے کچھ ایسا کہہ دیا تھا کہ ناظمہ ہچکیاں لے کر رو پڑی تھی۔

"روؤ گی تو اپنے آپ کو اپنی بہنوں کو کیسے ..... سنبھال سکو گی، بیٹا۔"

امی نے پاؤں فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ ناظمہ کے کندھے کا سہارا لیکر چلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک آنسو ان کی پلک پر اٹکا ہوا تھا۔ وہ سیدھی کھڑی نہیں رہ پا رہی تھیں۔ اتنی تکلیف سہنے کے باوجود ان کے چہرے کی رونق کچھ ایسی کم نہیں ہوئی تھی۔ لگتا تھا کوئی ہرا بھرا پیڑ طوفان کی زد میں آکر عین درمیان سے ٹوٹا چاہتا ہو۔ وہ صرف ذرا کمزور لگ رہی تھیں۔ مگر جب ناظمہ انہیں غسل خانے کی چوکی پر بٹھا کر سیدھی ہوئی تو اس نے دیکھا کہ ان کی ٹانگوں پر سیاہی مائل سرخ رنگ کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

اس کے بعد سے امی کے بستر کی چادر بے داغ نہ رہ سکی اور آہستہ آہستہ ان کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ تب سے مہینوں گذر گئے۔ خدا جانے کتنا خون ہے ان کے جسم میں جو مہینوں سے لگاتار بہہ رہا ہے اور ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ امی اب اتنی دبلی ہو گئیں ہیں کہ اگر ان کی ڈھیلی سی چارپائی پر چادر تان کر بچھا دی جائے تو معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ وہاں کوئی لیٹا بھی ہے۔ اور باپ کے لیے تو ویسے بھی وہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھیں۔

امی کو کتنا ارمان تھا اپنی بچیوں کی اونچی تعلیم کا۔ وہ خود ہی محنت مشقت سے ان کی پڑھائی کا خرچ پورا کرتیں۔ اس میں باپ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ باپ کو اپنے علاوہ گھر میں کسی اور کی بہبودی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہاں امی کے پٹی سے لگ جانے کے بعد وہ صرف ناظمہ کو ہی ہر کام کے لیے بلاتا۔

وقت بے وقت وہ باپ کے کمرے میں ہوتی۔ امی کھٹیا پر پڑی کراہتیں۔ نحیف آواز میں ناظمہ ناظمہ پکارتیں...... اور ناظمہ دیر بعد سسکتی، لڑکھڑاتی آتی۔ امی کے چارپائی کی پائنتی پکڑ کر گر سی پڑتی۔ امی، باپ کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ دیکھ کر جانے کیا کیا بڑ بڑاتیں...... ہاتھ دعا میں اٹھاتیں...... آنسو بہاتی ہوئی، نقاہت بھری آواز میں سانپ سانپ چلاتیں اور بے ہوش ہو جاتیں۔ ان کی گردن ایک ہی طرف کو اس طرح ڈھلک سی جاتی جیسے گردن میں سہارا دینے کے لیے ان کی کھال کے اندر، کہیں کوئی ہڈی ہی نہ ہو۔ ڈھلکی ہوئی کھال والی یہ گردن بھی کبھی کسی صراحی کی طرح ہو گی، اس کا یقین کرنا مشکل تھا۔

باپ، امی کو کبھی ڈاکٹر کے پاس لے کر نہ گیا۔ اس کے پاس پیسہ ہی کہاں تھا۔ اس کے تو اپنے ہی اخراجات بمشکل تمام پورے ہوتے۔ ٹوٹے پھوٹے ٹرانزسٹرس (Transistors) کی مرمت کر کے وہ اپنی مے نوشی اور ایک وقت کی روٹی کا بندوبست ہی کر پاتا تھا۔

اور امی......؟ ان کی تو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں ہی ان کا مائیکا بھی تھیں اور سہیلیاں بھی۔

باپ کے ہاتھ میں بنڈل دیکھ کر شائستہ اور ساحرہ نے بھی کتابوں سے نظریں ہٹا لیں تھیں۔ شائستہ سب میں چھوٹی تھی۔ کوئی دس برس کی۔ گول مٹول سی۔ بغیر کھائے پیئے بھی تر و تازہ نظر آنے والی۔ امی اپنی بیماری سے پہلے اسے خوا مخواہ ہنستے رہنے پر بہت ڈانٹا کرتی تھیں۔ اب امی اسے کچھ نہیں کہتیں۔ اب وہ ہنستی بھی نہیں۔ امی کے سرہانے پہروں بیٹھ کر کبھی ان کے بالوں میں ننھی ننھی انگلیوں سے کنگھا کرتی، کبھی ان کا ماتھا سہلاتی۔ اور کبھی ان کا سر اپنے چھوٹے سے زانو پر رکھ کر لوری گاتی۔ ایسے ہی جیسے کبھی امی گایا کرتی تھیں:

چھوٹے سے پلنے میں سوئی ہے گڑیا — ننھے خیالوں میں کھوئی ہے گڑیا
نندیا سے بھاگے جب دیکھو جاگے — گڑیا نہیں ہے یہ آفت کی پڑیا
کوئی شرارت کرتی رہے گی — بس نیند سے صرف لڑتی رہے گی
پریوں نے آکے جھولا جھلایا — بلبل نے گا کر نغمہ سنایا
تتلی نے پنکھوں کی پنکھی بنائی — جب جا کے اِن کو کہیں نیند آئی
اک آنکھ کی بند کر کے کٹوری — دوجی سے دیکھے مگر چوری چوری

بہت پہلے جب امی آخری دو مصرعے گایا کرتی تھیں تو اس وقت شائستہ ایک آنکھ میچ کے، لبوں پر شرارت بھری مسکان لیے امی کو دیکھا کرتی۔ اور امی اس کا مکھ چوم کر اسے

گدگدی کرڈالتیں۔ تب وہ خوب ہنس دیتی تھی۔

تب بات اور تھی۔ جب وہ چھوٹی سی ہوا کرتی تھی۔ مگر اب تو شائستہ اپنی امی سے بھی بڑی ہو گئی تھی۔ اسے امی کی اماں ہو جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک سوگوار سا سکھ اس کے منے سے دل میں آٹھہرتا۔

اس نے بہت پہلے بھی یہ چاہا تھا کہ وہ امی کو لوری سنا کر اپنے زانو پر سلادے۔ مگر ہنستی ہوئی امی کو۔ نم نم سی آنکھوں والی اس امی کو تو وہ بس دیکھتی رہتی۔ کبھی گھٹنوں کے بل کھڑی ہو کر پانی کے کئی کئی چمچے پلادیتی کبھی امی کے ہی انداز میں چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے لوری گانے لگتی۔ جب شائستہ لوری کے آخری مصرے گاتی تو امی کی آنکھوں کو بغور دیکھا کرتی۔ امی دونوں آنکھیں بند کر دیتیں۔ ان کی آنکھوں کے کونوں سے نمی چھلک پڑتی۔ پھر امی گھنٹوں آنکھیں نہ کھولتیں۔ کم از کم شائستہ نے یہی دیکھا تھا حالانکہ امی کے پاس سے جاتے وقت وہ مڑ مڑ کر بھی دیکھا کرتی تھی۔

باپ کی نگاہیں کبھی کبھی شائستہ کے ننھے سے بدن کا طواف کر کے اس کے بھرے بھرے رخساروں پر ٹھہر جاتیں۔

وہ منہ بھر بھر اس کے گالوں کے کئی کئی بوسے بھی لے لیتا۔ مگر ساحرہ سے وہ کبھی بات نہ کرتا تھا۔

بہت دن پہلے جب ایک دن اس نے ساحرہ کو کسی کام سے کمرے میں بلایا تھا تو وہ وہاں کچھ سیکنڈ بعد ہی زور زور سے چیخنے لگی تھی۔ ناظمہ اور شائستہ کمرے کی طرف دوڑیں تھیں۔ صحن کی کچی اینٹوں سے بنی، بھربھری، مٹی کی دیوار کے اس پار سے زہرہ خالہ نے لکڑی کی جالی دار کھڑکی کھولی تھی۔ مگر تب تک ساحرہ کمرے سے باہر آچکی تھی۔ امی کی چارپائی کی چرمراہٹ میں ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ کا گماں ہوتا تھا۔ انہوں نے بمشکل تمام اپنا سر ذرا سا او[illegible] کھولتی ہوئی فتح یاب ساحرہ کو دیکھ کر ایک اطمینان بھری ٹھنڈی سانس [illegible]

باپ اگر ساحرہ سے کبھی بات کرنے پر مجبور ہوتا تو نہایت گندی زبان استعمال [illegible] تا۔ ویسے بھی وہ سارے کنبے پر سوسو تہمتیں [illegible] لگاتا اور اکثر و بیشتر ہی وہ نشے میں ہوتا تھا۔

بنڈل دیکھ کر ساحرہ سمجھ گئی کہ ناظمہ کے لیے کوئی گرم کپڑا ہوگا شاید [illegible] خود اس کے پاس بھی اوڑھنے کو اس کے بستر کی چادر ہی ہے۔ جسے وہ [illegible] بھی لپیٹے پھرا کرتی ہے۔ مگر

باپ کی اپنے لیے نفرت وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ سمجھتی تھی اور اندر ہی اندر پھنکتی رہتی تھی۔ اس لیے دوسرے ہی لمحے اس نے سوچ کا رخ موڑ دیا۔

نہیں چاہیے اسے کوئی سویٹر۔

باپ بھلے ہی ناظمہ سے نسبتاً کم ناراض رہتا مگر کسی کے لیے کچھ لے آتا..... ؟ وہ پل بھر کو سوچنے لگی۔ پھر اس نے سر زور سے جھٹک دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

بنڈل امی نے بھی دیکھا تھا۔ بہت پہلے جب اس کی شادی باپ سے ہوئی تھی تو اسے جہیز میں ایسے ہی گہرے سرخ رنگ کا کمبل ملا تھا۔ گھر میں خوب استعمال ہوا تھا اس کمبل کا۔ کبھی اوڑھنا بنا کبھی بچھونا۔ اور کبھی امی اسے کھاٹ پر پھیلاتی تو وہ چادر سے بھی خوبصورت لگتا۔ اس کے کناروں پر نیلے رنگ کی اون سے بیلیں بنی ہوئی تھیں۔

درمیان میں سے گھس گیا تو اسے دو ٹکڑوں میں بانٹ دینا پڑا تھا جو بچوں نے الگ الگ اوڑھے تھے۔ اب بھی اس کا ایک بچا کھچا ٹکڑا باورچی خانے کے پائیدان کی جگہ استعمال ہوتا۔

امی کو خیال آیا کہ شاید جاگتے ہوئے شیطان کا خفتہ انسان بیدار ہو گیا ہو۔ کہ امی کے پاس بستر کے نام پر ایک چیتھڑا گدّا اور ایک چادر ہی تو تھی۔ اور گھر میں سب سے زیادہ سردی اس خون نچڑے وجود ہی کو لگا کرتی تھی۔ مگر باپ سے اس طرح کی توقع کرنے کے خیال سے وہ اور گہری سوچ میں پڑ گئیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد انہوں نے قریب سے گذرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔

"کیا لائے..... ؟" جانے امی نے یہ سوال کیسے کر دیا۔ کہ وہ تو اس کی طرف دیکھتی ہی تھیں نہ بات کرتیں۔ امی کی چارپائی باورچی خانے کے باہر چھوٹی سی راہداری میں ایک طرف کو بچھی ہوئی تھی۔ انہوں نے خود ہی اس جگہ کا انتخاب کیا تھا کہ کمرے کے اندر انہیں دنیا سے رابطہ ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ راہداری کا ایک دروازہ باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ جہاں سے باپ کے کمرے کا دروازہ نظر آتا تھا۔ دوسرا دروازہ صحن میں کھلتا تھا جس کی سیدھ میں آنگن کا باہری کواڑ تھا۔ کواڑ کے کھلنے سے گلی کا منظر بھی نظر آجاتا تھا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ، خوانچے، چھابڑی والے وغیرہ۔

باپ جب راہداری سے گذرتا تو امی منہ دیوار کی طرف موڑ لیتیں۔ مگر آج انہوں نے نہ صرف باپ کی طرف دیکھا تھا بلکہ بات بھی کی تھی۔ "کفن لایا ہوں تمہارے لیے۔" باپ نے نفرت اور غصے سے کہا تو اس کی سانسوں کے تعفّن سے فضا مکدر ہو گئی۔ آواز یوں معلوم ہو رہی

تھی جیسے وہ کچھ چبا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ کچھ زیادہ ہی سرخ ہو رہا تھا۔ ماتھا سر کے درمیان تک پھیلا ہوا تھا۔ اور چہرے پر دو تین دن کی سیاہ اور سفید رنگ کی داڑھی تھی۔ قمیض کے رنگ کا صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا۔ تاہم سیاہی مائل سا کوئی رنگ رہا ہوگا۔ پتلون میں پھنسا کمر بند ڈھلک کر اتنا نیچے آگیا تھا کہ قمیض کے نچلے ٹوٹے ہوئے دو بٹنوں میں سے اس کا پیٹ باہر کو لٹک رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہر روز ڈھلا، سِلا ٹھیک ٹھاک لباس پہن کر جاتا تھا۔ مگر جب رات کو لوٹتا تو اس کے کپڑے پھٹے ہوئے بھی ہوتے اور خاصے میلے بھی۔

اس کی بات سن کر امی کی آنکھیں نم سی ہوگئیں۔

"کفن...... ؟ وہ تو...... وہ تو میں سال بھر سے پہنے ہوئے ہوں۔" امّی نے یاسیت میں ڈوبی آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہا اور سر جھکا کر اپنے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں کہ وہ گرم لہو جوان کے تندرست بدن میں زندگی کا غمّاز بن کر دوڑا کرتا، اب ان کے بدن کے باہر رسا کرتا تھا۔ کبھی پھیل جاتا کبھی پپڑیوں کی شکل میں، پنڈلیوں پر جم کر کسی زخمی ناگن کی کینچلی کی طرح معلوم ہوتا۔ یوں بھی امی اپنے بدن میں نہیں تھیں۔ وہاں ان کی بجتی ہوئی ہڈیوں کے اوپر ان کی نیم چتکبری کھال تھی۔

"مگر پھر بھی زندہ ہو اور لعنت بن کر سر پر سوار ہو۔" باپ شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ پھر لڑکھڑایا اور گرنے ہی والا تھا کہ دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔

"مر کر بھی تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دوں گی...... شیطان...... درندے...... سانپ...... ہو تم...... اپنے ہی بچوں کو کھاتے ہو...... سانپ...... میری معصوم کلیوں کو...... میری بچیوں پر...... میری...... میری......"

امی کی سانسیں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔ ان پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ "کاش...... کاش...... میں تمہیں...... میں...... تمہیں کوئی...... سنگسار کیوں نہیں...... کر دیتا۔"

امی کی آواز ڈوب گئی اور وہ بے ہوش ہوگئیں۔

شائستہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باپ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اور بنڈل کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ "اس میں — کیا ہے؟" وہ بنڈل کو چھوتی ہوئی سر جھکائے ہوئے بولی۔

"اس میں...... ناظمہ سے کہو کھانا لائے۔" باپ نے شائستہ کے گال پر چٹکی بھر کر بے تاثر آواز میں کہا۔

باورچی خانے کے دروازے کی اس طرف سے ساحرہ ماتھے کا کونا دوسرے طرف کیے، ایک آنکھ سے اندر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ باپ کی جب اس پر نظر پڑی تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ساحرہ نے ہونٹ، اتنی سختی سے دانتوں تلے دبایا کہ خون کو بوند اس کی زبان نمکین کر گئی۔

ساحرہ آٹھویں درجے کی طالبہ تھی۔ اپنی کلاس کی مانیٹر تھی اور زہرہ خالہ کی چوتھی جماعت میں پڑھنے والی بیٹی کو ٹیوشن بھی دیتی تھی۔ اس کا قد اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی نکلا ہوا تھا۔ امی کو گود میں اٹھا کر غسل خانے وغیرہ تک لے جایا کرتی تو گردن خم کر کے امی کے ماتھے پر اپنا رخسار رکھے رکھتی۔ کس قدر سنجیدہ نظر آتی تھی اس وقت۔ ویسے طبعاً خاموش تھی، دھن کی پکی، ذہین اور محنتی بھی تھی۔

ساحرہ بدستور باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب دونوں آنکھوں سے۔

ناظمہ تھالی میں موٹی سی روٹیاں اور کٹوری میں پتلی سی دال لے کر اندر آئی اور بغل میں دبا ہوا چیتھڑا دستر خوان نکال کر باپ کے سامنے پھیلایا اور کھانا پروس دیا۔

"ہری مرچ کہاں ہے؟" باپ ناظمہ کو دیکھ کر زور سے بولا۔ ناظمہ نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس جلدی سے دستر خوان پر رکھ دیا جو اس کے بدن کی کپکپی سے چھلکا ہی چاہتا تھا۔ جب وہ اٹھنے لگی تو باپ نے اس کے شانے کے پیچھے ایک بھاری سی تھپکی دی اور اس کی پوری پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اس کے کندھے کو انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان زور سے پکڑ کر آواز دھیمی کر کے بولا "آج ہری مرچ نہیں ہے کیا؟"

"چھ دنوں سے سبزی نہیں لی نا۔ مرچیں ختم ہوگئیں۔ بغیر سبزی خریدے، سبزی فروش مرچ دیتا ہی نہیں۔" ناظمہ نے بات کرتے ہوئے کندھا آہستہ سے چھڑا دیا اور اٹھ کر اندر جانے لگی۔

"تم کیا لینے جا رہی ہو جب مرچ نہیں ہے گھر میں۔" وہ ایسے گرجا جیسے بادل پھٹ گئے ہوں۔

"میں ــــ چولہا ٹھنڈا کرنے ــــ ابھی آگ جل رہی ہے نا۔" وہ شانہ سہلاتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"ابھی تک آگ بجھائی نہیں ــــ حرا...... اتنی لکڑی کہاں سے آئے گی۔ میں تم سب کو ــــ تم سب کو لے جا کر میں کسی ...... کسی ...... کوٹھ ......

تم اسی لائق ہو...... کہ...... میں" باپ غصے میں کانپ رہا تھا۔ اس کے بدبودار منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ ایسی حالت میں جب وہ غصہ کیا کرتا تو اس کا دہانہ ایک طرف کو خمیدہ ہو جاتا۔ جیسے چہرے کو لقوہ مار گیا ہو۔ اس کا سارا چہرہ ہی میڑھا معلوم ہو رہا تھا۔ سرخ کنچوں جیسی گول گول آنکھیں جیسے باہر کو گرنے والی تھیں۔ ماحول خوفناک ہو گیا تھا۔

اور...... کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اس سے کہہ سکے کہ اس کے آنے میں آدھی رات کیوں نہ ہو جائے مگر اس کے لیے بار بار چولہا سلگانا پڑتا ہے کیونکہ لکڑی کی بچت کی خاطر اسے بار ہا بجھایا گیا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ ایسا کہرام مچاتا ہے جس کی وجہ سے تقریباً سارے محلے نے ان سے تعلق ہی توڑ لیا ہے۔

دروازے کے پاس کھڑی ساحرہ پھیلی پھیلی مگر بے خوف آنکھوں سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ باپ نے اسے اس طرح گھورتے ہوئے دیکھا تو کھانے کی رکابی کھینچ کر اس پر پھینکی۔ وہ پرے ہو گئی اور نشانہ چوک گیا اور رکابی چولہے پر جا لگی۔ دال کی پتیلی چولہے سے نیچے گرتے ہوئے اپنے ساتھ ایک دو ادھ ٹوٹی اینٹیں بھی اکھیڑ لائی۔ اوپر کے طاقچے کی مٹی اکھڑ کر نیچے گر گئی اور ایک لمبی سی اینٹ دکھائی دینے لگی۔

"چلو میرے...... کپڑے دو...... حرا......" وہ غصے سے بھناتا ہوا کھڑا ہو کر ناظمہ سے مخاطب ہوا اور وہ تھر تھراتی ہوئی باپ کے پیچھے چلنے لگی۔

ساحرہ نے دیکھا کہ طاقچے کے اکھڑے ہوئے حصے کی اینٹ بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس کے ذرا سے ہلانے سے اینٹ اس کے ہاتھ میں آئی تو اس نے اینٹ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ باپ باورچی خانے میں سے گذرنے ہی والا تھا۔ سرخ بنڈل دہیں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ شائستہ نے باپ کو اندر کی طرف جاتے دیکھا تو اسے کھولنے لگی۔

یہ ایک بڑے سائز کا مردانہ اوور کوٹ تھا۔ جو باہر سے گہرے مونگیا رنگ کا تھا اور اندر سرخ رنگ کا دبیز اونی استر لگا تھا جو دو ایک جگہوں سے شاید چوہوں نے کتر ڈالا تھا۔ باپ اسے کسی کباڑی کی دوکان سے لایا ہو گا۔

شائستہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے میں محو تھی۔ باورچی خانے سے گڑگڑاہٹ جیسی چیخ سن کر امی نے غنودگی سے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں۔

ناظمہ راہداری میں آئی تو کھلا ہوا اوور کوٹ، امی کے دراز بدن پر پھیلاتے ہوئے بولی:

"وہ چولہے سے دال کی پتیلی اتار رہا تھا کہ چولہا ٹوٹ گیا۔ اوپر کے طاقچے کی ایک اینٹ بھی اکھڑ کر اس کے سر پر گر گئی...... باورچی خانے میں خون پھیل رہا ہے ساحرہ، زہرہ خالہ کو بتانے گئی ہے۔"

امی نے آنکھ سے بہہ کر کان کو طرف جاتا ہوا آنسو پونچھ لیا اور آہستہ سے آنکھیں موند لیں۔

شائستہ نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔

□□

("نیا سفر" الٰہ آباد، ۱۹۹۹ء — "صریر" کراچی، ۱۹۹۹ء)

اچھّی صورت بھی کیا

"میری ممی مجھے لینے آرہی ہے نا آنٹی؟"

سنہری بالوں اور بھوری آنکھوں والے گڈے نے آنکھیں میچنے سے پہلے کہا کہ اس کی آنکھیں شاید نیند یا پھر دواؤں کے اثر سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

ثنا نے جب اثبات میں سر ہلایا تو اس کے سوکھے پژمردہ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ثنا نے اس کی بند آنکھوں پر ابروؤں کو انگلی کے پوروں سے سنوارا اور پھر اس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کچھ دیر کے لیے اپنا ہاتھ اس کے نرم نرم ماتھے پر رہنے دیا اور مطمئن ہو کر اپنا بدن کرسی پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اب راہل اچھا ہو جائے گا...... وہ آنکھیں موندے کرسی کی پشت سے سر ٹکائے سوچنے لگی۔ واقعی کچھ دن پہلے کے اور آج کے راہل میں بہت فرق تھا۔

اس دن ثنا اپنے گروپ کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ سیلاب زدگان کی مدد کے لیے قریب کے ایک گاؤں میں گئی تھی۔ جب صبح اس کی ویگن شہر کے ایک خاص چوک سے گذری تھی تو دسمبر کی سردی میں سڑک کے کنارے پر ٹھٹھرتے ہوئے ایک بچّے کو اس نے بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اکثر ہی شہروں کے ٹریفک سگنلز کے پاس لوگ بھیک مانگا کرتے ہیں۔ اور اکثر ہی ثنا اس طرح کسی کو دیکھ کر سوچنے لگ جاتی۔

"تمہیں اس چھوٹے سے کُرتے میں سردی نہیں لگتی؟" ایک چار پانچ سالہ بچّے سے ثنا نے ایک دفع پوچھا بھی تھا۔

"نہیں تو...... میں تو سوتا بھی اسی میں ہوں...." بچّے نے بہتی ہوئی ناک کو زور سے سانس لے کر نتھنوں میں سمیٹتے ہوئے کہا تھا۔ "میری بہن بھی تو ایک ہی فراک پہنے ہوئے

ہے.... وہ ادھر.....'' اس نے ہنستے ہوئے بتایا..... ثنا نے اس کی ہتھیلی پر ایک سکہ رکھ دیا تو وہ اچھلتا کودتا آگے والی گاڑی کے پاس پہنچ گیا۔

''تیرے بچے جئیں صاب..... ایک روپیہ دے دو..... میری ماں کو بچہ ہونے والا ہے ..... درد سے تڑپ رہی ہے۔'' اس نے اداس صورت بنا کر التجا میں سر ہلایا تو ثنا کو ہنسی آگئی۔ اس سے پہلے جب وہ گاڑی کی کھڑکی پر بھیک مانگنے آیا تھا جب بھی ثنا کو اپنی ہنسی ضبط کرنا پڑی تھی کہ اس نے ثنا اور اس کے چودہ سالہ بھانجے کو برابر کی نشستوں پہ بیٹھا دیکھ کر دعا دی تھی۔

''تمھاری جوڑی بنی رہے بی بی جی..... میری ماں کو.....''

وہ چہرے پر کامیابی سے اداسی اوڑھ کر بولا تھا..... مگر ثنا نے اس کی پوری بات سننے سے پہلے اس سے اس کے کُرتے کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ ساری اداکاری بھول کر فطری انداز میں باتیں کرنے لگا تھا..... اور انگلی کے اشارے سے چوک کی دوسری طرف اس نے گود میں ننھی سی بچّی لیے اپنی اماں بھی اُسے دکھائی تھی۔

سامنے والی گاڑی سے کچھ نہ پا کر جب وہ دوسری طرف کو اٹھلاتا ہوا لپکا تو ثنا کو اس ننھے سے ٹھگ پر پیار آ گیا تھا۔

سگنلز کی بتی ہری ہو گئی تھی اور ثنا نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے دیکھا کہ وہ پٹری پر بیٹھا اپنے کُرتے کے اوپر لٹکتی ہوئی جیب میں سے پیسے نکال کر انھیں الٹ پلٹ دیکھتا ہوا اپنی ننھی ننھی ٹانگیں جُھلاتا اونچی آواز میں کوئی فلمی گانا گاتا ہوا انھیں گن رہا تھا۔ اور دوسری طرف سے اس کی ماں اس کے انتظار میں تھی کہ وہ پیسے جیب میں رکھے تو وہ اسے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گرم گرم چنوں کی پڑیا تھما دے۔

مگر یہ بچہ جو آج ثنا نے چوک میں دیکھا تھا وہ بھیک مانگنے والے اکثر بچوں سے مختلف تھا۔ جو بچّے اس نے بھیک مانگتے دیکھے تھے وہ خالص کاروباری انداز میں بھیک مانگا کرتے۔ بھیک مل گئی تو ٹھیک نہ بھی ملی تو کچھ قدم آگے بڑھا دے۔ یہ بچہ کچھ اس انداز میں بلک بلک کر صدائیں لگاتا تھا کہ دل دہل جاتا۔ نم آنکھیں لیے رقت بھری آواز میں..... رک رک کر جیسے درد سے کراہ رہا ہو..... دیکھنے میں وہ صحت مند نظر آ رہا تھا۔ خوبصورت بھی بہت تھا۔ گورا رنگ سنہرے بال بھوری آنکھیں۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ موڑی رکھی تھی ایک

پھیلا رکھی تھی۔ سڑک کے کنارے پڑی بجری کے ڈھیر کے ساتھ اس نے اپنی پیٹھ ٹکا سی دی تھی۔ پھٹے ہوئے یا پھاڑے گئے پاجامے میں سے اس کا مڑا ہوا گھٹنا نظر آ رہا تھا جو زخمی تھا۔
ثنا نے کھڑکی سے کچھ سکے اس کی طرف اچھال دئے۔ ویگن آگے بڑھ گئی۔
شام کو جب یہ قافلہ لوٹا تو ثنا نے ایک دوسری سڑک پر ویسی ہی دلدوز صدا سنی تو دیکھا کہ وہی بچہ اب رو رو کر بھیک مانگ رہا تھا اس کے بھرے بھرے سنہرے رخساروں پر موٹے موٹے آنسو پھیل رہے تھے اس کے پیارے سے مکھڑے کو دیکھ کر دل میں ہمدردی کے ساتھ پیار بھی اُمڈ آتا تھا۔ راہگیر اس کے سامنے پھیلے کپڑے پر کبھی سکے کبھی نوٹ ڈال جاتے تو ایک نظر اسے غور سے دیکھنے پر مجبور سے ہو جاتے۔
سارا راستہ ثنا کی آنکھوں میں بلک بلک کر بھیک مانگتے ہوئے اس بچے کا چہرہ سمایا رہا...... بچہ کیوں رو رہا تھا؟ صدائیں لگانا اس کا کاروباری انداز ہو سکتا ہے مگر آنسو بہانا...... وہ گھر پہنچ کر اب باقاعدہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے ویسے بھی اپنی زندگی دوسروں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ دوسروں کے سکھ میں اسے اپنے دکھ مٹتے ہوئے دکھائی دیتے۔ خود اس نے اپنے حصے کے دکھوں سے کچھ زیادہ ہی دکھ پائے تھے۔ مگر وہ دوسروں کے دکھوں سے بھی اسی طرح غمگین و پریشان ہو جاتی جیسے اپنے دکھوں سے۔ ان کے مختلف مسائل حل کرنے کے سب پہلوؤں سوچتی اور سوچتی چلی جاتی...... جب تک بات بنتی نہیں بے چین رہتی۔
"برتن والے چوک میں ایک سات آٹھ سالہ بچہ بھیک مانگ رہا ہے۔" ثنا نے علاقے کے انسپکٹر کو فون کیا۔
"میڈم ہر چوک پر کئی بچے بھیک مانگتے ہیں...... بلکہ ان کے ماں باپ بھی۔"
"میں ثنا بول رہی ہوں انسپکٹر صاحب...... مجھے کچھ شبہ ہے۔"
"اوہ میڈم...... آپ ہیں...... کس طرح کا شک؟"
"صبح سے میں نے اسے دو مختلف جگہوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے...... بچہ لگاتار رو بھی رہا ہے...... زخمی بھی ہے...... پتہ نہیں...... کیا بات ہے۔"
انسپکٹر ساجد سہروردی تھانے سے کچھ سپاہیوں کو لے کر نکلے تو ثنا بھی گھر سے نکلی۔ دونوں تقریباً ساتھ ساتھ چوک پر پہنچے۔
بچہ وہیں تھا...... اس کی آواز تقریباً بیٹھ گئی تھی۔ پکار جاری تھی۔ آنکھیں بار بار بند ہو

رہی تھیں سنہرے بالوں پر دھول کی ایک موٹی تہہ جم چکی تھی۔ آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ناک سردی سے سرخ ہو رہی تھی۔

انسپکٹر ثنا کو بچّے کی طرف بڑھتے دیکھ کر خود بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ایک نظر چاروں طرف دوڑائی......اور بچّے کے قریب کھڑا ہو گیا۔

"کیا نام ہے تمھارا......؟" ثنا نے بچّے کے پاس بیٹھ کر آہستگی سے کہا۔

"ہاں بیٹا کیا نام ہے......" انسپکٹر سہروردی نے رکوع میں جھک کر پوچھا تو ایک لمبی پتلی سانولی عورت دوڑتی ہوئی آئی۔

"مُنا......مُنا...... کیا ہوا میرے بچّے کو۔" اس کا سن کوئی پینتالیس چھیالیس کے آس پاس تھا۔ ناک بڑی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور کسی قدر دھنسی ہوئی۔ دونوں آنکھوں کے گرد ہڈیوں کے دائرے اتنے واضح تھے جیسے کسی نے پرکار سے کھینچ رکھے ہوں۔ دانت سیاہی مائل زرد اور ادھ ٹوٹے۔ میلے میلے سے ناخن اور لباس بھی میلا۔ گو کہ لباس پرانا نہیں تھا۔ بچّے کی شکل صورت سے اس کی مشابہت نہ تھی اور اس کے جملے کی مناسبت سے اس کی آواز میں تجسّس تھا نہ پریشانی۔

"یہ تمہارا بچّہ ہے؟" انسپکٹر نے ہاتھ میں لی ہوئی چھڑی عورت کی طرف اٹھا کر پوچھا۔

"ہاں صاب میرا ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"بیمار ہے کیا......؟" ثنا نے بچّے کے زخمی گھٹنے کو دیکھ کر کہا اور اس کا پائجامہ، سر، کاکر، زخم کا معائنہ کرنے لگی۔

"نہیں جی......ہاں جی......وہ تھوڑا...... گر گیا تھا۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام رضیہ ہے صاب جی۔"

"اور بچّے کا؟" اس دفعہ انسپکٹر نے سوال کیا۔

"میرا نام را......" بچّے کی بات پوری ہونے سے پیشتر ہی عورت بولی۔

"اس کا نام راشد ہے جی۔" اس نے کہا اور چہرے پر خوشامدانہ سی مسکراہٹ سجا کر دونوں کو باری باری دیکھنے لگی۔

"کتنے بچّے ہیں؟" انسپکٹر سہروردی ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے اپنی ٹانگ تھپکتا ہوا

بولا۔

"دو اور ہیں...... وہ اُدھر۔" بچّے نے عجلت سے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے سڑک کی دوسری جانب دکھاتے ہوئے اپنے بے ترتیب ہوتے ہوئے سانس کو قابو میں لانے کے لیے اپنا چھوٹا سا سر اپنے بائیں کندھے پر ٹکا دیا۔ اس کے چہرے پر عجیب تجسّس بھری متفکرانہ سی امید کے تاثرات تھے۔

"وہ میرے بچّے نہیں صاب جی۔" عورت نے بظاہر پُرسکون آواز میں کہا "وہ تو پتہ نہیں کون ہیں۔" وہ بچّے کی طرف رُخ کر کے چہرے پر نرمی سی طاری کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اس کے کانپتے نتھنوں اور تڑپتی ہوئی پتلیوں سے اس کا ذہنی اضطراب صاف عیاں تھا۔

"چپ ہو جا...... طبیعت خراب ہے تیری زیادہ بولا نہیں کرتے۔" اس نے ترچھی نظر سے بچّے کے گھٹنے کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بے تحاشہ آئے ہوئے غصے کو مسلسل دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بلکہ اس کی شہادت کی انگلی تنبیہ کے طور پر اب بھی بچّے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ بچّے نے اپنا ہاتھ چھوٹے سے دہانے پر رکھ لیا اور عورت کو خوف زدہ سی آنکھوں تکتا رہا۔ اس کا پیلا چہرہ اب سفید پڑ گیا تھا۔

"بات کیا ہے...... ذرا ٹھیک ٹھیک بتاؤ......" انسپکٹر نے کچھ سختی سے کہا اور سپاہیوں کو چوک کی دوسری طرف جانے کا اشارہ کیا۔

"میں ان بچّوں کو نہیں جانتی صاب۔" عورت انسپکٹر کی طرف بے تاثر نظروں سے دیکھتے ہوئے سکون سے بولی۔

"یہ ہی ایک بچّہ ہے تمہارا؟" ایک خاتون حولدار نے پوچھا "تم تو اب بھی پورے دنوں سے معلوم ہوتی ہو۔"

خاتون حولدار نے عورت کا پیٹ چھو کر کہا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ اس کے پیٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ اُبھار گولائی میں نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہونے والے بچّے کی موجودگی والی سختی ہے وہ کچھ عجیب بے ترتیب سا کوئی بوجھ لیے ہوئے تھی...... خاتون حولدار نے اس کے میلے کچیلے گھاگھرے میں پھنسا دوپٹہ کھینچا تو کئی چھوٹے بڑے نوٹ اور ڈھیروں سکّوں کے ساتھ لوہے کی ایک چھوٹی سی سلاخ بھی گری۔

"یہ میرے پیسے ہیں صاب جی...... میں نے بہت دنوں سے اکٹھے کیے ہیں۔" وہ جھجک

کر عجلت سے پیسے جمع کرنے لگی۔

''یہ میری نہیں ہے۔'' اس نے بے خیالی میں سلاخ اٹھا کر چھوڑ دی۔ یہ پیسے ہم نے دیے ہیں رضیہ بی کو۔ سپاہیوں کے ساتھ آنے والے بچوں میں سے ایک تقریباً پانچ سال کی عمر کے بچّے نے ننھا سا سر فخر سے تان کر کہا۔ ''ہاں میں نے بھی دیے ہیں'' دوسرے بچّے نے جو مشکل سے چار برس کا رہا ہوگا اُس کی تائید کی۔

''رجیہ بی ہماری پچی کی ماں ہے۔'' وہ عورت کو دیکھ کر معصوم سے چہرے پر کامیابی کے ساتھ مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''دیکھا رضیہ بی ہم نے اور کچھ نہیں بتایا نا؟...... ہم کو مت مارنا۔'' وہ ملتجیانہ لہجے میں کہنے لگا عورت نے پولیس کی طرف نظر اٹھائی تو خاتون حولدار نے بڑھ کر اُس کی زنگ آلود نل جیسی کلائی میں ہتھکڑی پہنا دی۔

ثنا نے راشد کا ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھانے کی کوشش کی تو وہ کھڑا نہ ہو سکا۔ اس کی دائیں ٹانگ بری طرح زخمی تھی اور کمزوری اور نقاہت کے باعث وہ ایک ٹانگ پر ایستادہ نہیں رہ پا رہا تھا۔ ٹانگ کا زخم گل سڑ گیا تھا۔ اس میں بہت اوپر تک پیپ بھری ہوئی تھی اور درمیان میں سے جہاں زخم زیادہ گہرا تھا وہاں چھوٹے چھوٹے سفید دھاگے سے لہرا رہے تھے۔ ثنا نے جب غور سے دیکھا تو اس کے حلق میں اس کی چیخ گھٹ کر رہ گئی۔ وہ دھاگے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے بے شمار کیڑے تھے۔

لڑکے کا نام راشد نہیں راہل تھا۔ عورت واقعی بچّے اٹھانے والے گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے دو مرد ساتھی بھی پکڑے گئے۔ ان میں سے لعل سے عاری آنکھ والے لعل جی نے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے راہل کی ٹانگ پر سریا مار دیا تھا۔ وہ راہل کو اسی کے گھر کے باہر سے اٹھا لائے تھے۔

راہل کے والدین ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اس کا باپ شرابی تھا۔ نشے کی حالت میں وہ اپنی ہستی کو منوانے پر ایسا تل جاتا کہ گھر اور سکون دو جدا چیزیں ہو کر رہ جاتیں۔ باپ کھا پی کر سو جاتا اور ماں رات رات بھر روتی رہتی۔ جب باپ کی گرج بند اور ماں کی سسکیاں واضح ہو جاتیں تو راہل گھر کے کسی کونے سے نکل کر ماں کے پیٹ میں اپنے چھوٹے چھوٹے گھٹنے ٹھونس کر سو جاتا۔

اس رات راہل نے باپ کو ہاتھوں کی جگہ ماں کو ایک پرانی ہاکی سے پیٹتے دیکھا۔ جب ماں کے سر سے خون کی دھار بہہ نکلی تو وہ بہت ڈر گیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ باپ نے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو چلاّ چلاّ کر اس کا نام پکارنے لگا۔ باپ کی غصے میں کانپتی آواز سن کر وہ بھاگنے لگا۔

رضیہ بی نے اندھیرے میں بھاگتے ہوئے بچّے کو دیکھا تو دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ خود جیسے کہ اندھیرے سے اچانک پھوٹ نکلی ہو۔

''کہاں جا رہے ہو...... آؤ ہمارے ساتھ...... اندھیرے میں کوئی بھوت بھالو اٹھا لے جائے گا...... آؤ ہم بہت پیار کریں گے'' رضیہ بی نے اس کے شانے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ بچّے نے رفتار تیز کر لی تو رضیہ بی بھی تیز تیز چلنے لگیں۔

''پاپا ماریں گے۔'' وہ مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا بولا۔

''کوئی نہیں مارے گا۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔'' رضیہ بی نے سرگوشی کی سی آواز میں کہا اور راہل کو تقریباً دھکیلتی ہوئی تیز تیز چلنے لگی......

''نہیں پاپا صبح اٹھتے ہی مجھے بلائیں گے...... مجھے جانا چاہیے۔ پاپا ممی کو ہاکی سے مار ڈالیں گے۔ ممی ڈر رہی ہوں گی۔'' وہ چلتے چلتے ٹھہر گیا اور خود کو رضیہ بی کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے زار و قطار رونے لگا۔

''چلو نا ہمارے ساتھ...... ابھی جاؤ گے تو تمہیں بھی ماریں گے پاپا...... صبح ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیں گے۔''

عقب سے تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی تو راہل نے نئے نئے اسیر ہوئے پرندے کی طرح اپنی کانپتی ہوئی گردن ادھر ادھر گھمائی مگر اندھیرے میں اسے اور کوئی دکھائی نہ دیا جب اسے اور کچھ نہ سوجھ پایا تو اس نے اپنا خوف زدہ چہرہ رضیہ بی کے دامن میں چھپا لیا۔

کچھ ہی لمحوں میں لعل جی دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا اور راہل کے دوسرے کندھے پر اپنا پتھریلا ہاتھ رکھ کر چلنے لگا۔ اپنی اکلوتی آنکھ میں تعریف بھر کر جانے اس نے رضیہ بی سے کیا کہا کہ راہل نے دونوں کا قہقہہ سنا اور ان کو باری باری دیکھنے کی کوشش کی مگر لعل جی کا ہاتھ اس کے نرم شانے میں ایسے کھبنے لگا کہ وہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر تیز تیز چلنے لگا۔

دوسرے بچوں کے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے تھے۔ ایک کو ان کا ساتھی کاغذ جمع کرنے والے بورے میں ڈال کر لایا تھا۔ وہ بچہ اسے ایک سنسان بس اسٹاپ پر اونگھتا ہوا ملا تھا۔ اسکول بس اسے چھوڑ گئی تھی اور ابھی اسے لینے والا پہنچا نہ تھا۔ مستری کسی کی جیب کاٹ کر بھاگ رہا تھا اس نے تنہا بچّے کو نیند میں جھولتا دیکھا تو ادھر ادھر دیکھ کر رُک گیا۔

"تمہاری ممی نے مجھے بھیجا ہے۔ آؤ گھر جانا ہے۔" اس نے بچّے سے کہا تھا۔

"ممی نے......؟" بچّے نے نیند کے جھونکوں کے درمیان کہا۔

مستری نے باہیں پھیلائیں، بچہ اس کی گود میں آتے ہی سو گیا۔ جب وہ ایک تنگ گلی میں پہنچا اور دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہ آیا تو اس نے بچّے کو بورے میں منتقل کر دیا۔ گلی کے نکڑ کے قریب پڑی ہاتھ گاڑی کے نیچے اُنگھ رہا کتا بھونکنے لگا تو اُس نے اپنی رفتار تیز کر لی۔

مستری ہی تیسرا بچہ لایا تھا۔ وہ اس کے پڑوسی گاؤں کی ایک بڑھیا کا پڑپوتا تھا۔ مستری نے اسے پڑھائی کا لالچ دیا تھا۔ کچھ ماہ بعد بڑھیا کا انتقال ہو گیا۔ بچّے کا اور کوئی نہ تھا۔

پولیس نے چھوٹے بچّے کی کتابوں کا بستہ برآمد کر لیا اور ڈائری میں لکھے پتے سے اس کے والدین سے رابطہ قائم کر کے ایک پیچیدہ کیس کو حل کر لیا۔

بُڑھیا کا پڑپوتا بچہ گھر کے حوالے کیا گیا۔ اور راہل کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ تینوں بچّوں میں ایک یہ بات مشترک تھی کہ وہ عام بچّوں سے زیادہ خوبصورت تھے اور سب سے زیادہ خوش شکل راہل تھا۔ اس کی ٹانگ کے زخم کا علاج وقت پر نہیں ہوا تھا اس وجہ سے زخم میں (Tetanus) پھیل گیا تھا۔ اسپتال والوں نے اسے داخل تو کر لیا مگر چوں کہ ڈاکٹر صاحبان ہڑتال پر تھے اس لیے نرسیں وغیرہ مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کرتیں۔

نہلانے دھلانے کے بعد راہل ننھا سا شہزادہ معلوم ہو رہا تھا۔ ثنا لگاتار اس کے پاس جا رہی تھی۔ وہ اس سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ اسے اپنے والدین کا نام معلوم تھا اور اپنے ایریے (Area) کو وہ جواہر نگر بتاتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ پھر ہر شہر میں ایک آدھ جواہر نگر پایا جاتا ہے۔ پولیس کو اس کے گھر والوں کو تلاش کرنے میں خاص دشواری ہو رہی تھی۔ راہل اپنی ماں کو یاد بھی بہت کرتا تھا۔ ثنا روز اس کی امید بندھاتی تھی کہ اس کے گھر والے اسے لینے آنے والے ہیں...... پھر کون جانے اس رات اس کی ممی ہاکی کی مار سہہ بھی پائی تھی کہ نہیں......

آج ہڑتال کا بارہواں دن تھا...... کل ہڑتال ختم ہونے والی تھی...... پھر راہل اچھا ہو جائے گا...... ثنا اطمینان سے سوچنے لگتی۔ راہل نے ابھی ابھی آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ نہایت پرسکون نظر آرہا تھا۔ شاید وہ اپنی ممی کو خواب میں دیکھ رہا ہو۔ اپنی ممی کے سینے سے لپٹا ہوا رضیہ اور لعل جی کے مظالم سنا رہا ہو...... شاید پوچھ رہا ہو کہ اس دن پاپا کی ہاکی سے مارنے کے بعد ممی بچ گئی تھی یا نہیں۔

ثنا بھی آنکھیں بند کیے کرسی پر نیم دراز سی تھی۔ آج راہل کئی دن بعد مسکرایا تھا...... شاید اس کے ٹانگ کی تکلیف آج کم ہو گئی تھی۔ شاید زخم بھر رہا تھا۔ ثنا کو اس سے انسیت سی ہو گئی تھی...... اگر راہل کے والدین کا پتہ نہیں چلا تو وہ اسے اپنا بیٹا بنالے گی۔ اگر والدین مل گئے تو بھی وہ اس سے ملنے جایا کرے گی...... شادی تو اس نے کی نہیں تھی...... راہل کہیں بھی رہے وہ اسے اپنا بیٹا سمجھتی رہے گی۔ اس نے تصور میں راہل کو اپنی ممی کے برابر کھڑے کسی ان دیکھے دروازے کی دہلیز پر اپنا منتظر پایا...... اور خود وہ رنگین کاغذ میں لپٹے تحفے لیے اس کی طرف بڑھ رہی ہے......

اس کا دل آج پہلی بار یہ حسین تصور باندھ پایا تھا۔ فرطِ جذبات سے اس نے آنکھیں کھول دیں...... اور ہونٹوں پر ممتا بھری مسکراہٹ لیے راہل کی طرف دیکھا۔

راہل آنکھیں بند کیے لیٹا تھا...... مگر اس کا بدن نیلا پڑ چکا تھا اور ہڑتال ختم ہونے میں ابھی اٹھارہ گھنٹے باقی تھے۔

❑❑

("ایوانِ ادب" دہلی، ۲۰۰۰ء)

متاعِ گُم گشتہ

"کلکرنی صاحب کمرے میں آگئے ہیں" کسی نے دروازے سے اندر جھانک کر کہا، مگر رام موہن کنول کے چہرے کے تاثرات نہ بدلے۔ نہ انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا نہ وہ اپنی جگہ سے ہلے۔ وہ نہایت پُرسکون انداز میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اور اس سکون نے ان کے ہونٹوں کے آس پاس ایک عجیب مسکراہٹ سی سجادی تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو نظر نہ آنے پر بھی صاف عیاں تھی۔

کچھ دیر پہلے جب میں نے انہیں کمرے میں دیکھا تھا تو ان کی صورت ذرا مختلف تھی۔ وہ تقریباً غصے میں تھے اور کوئی دوسرے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی عمر کوئی اڑھتر اناسی کے قریب ہوگی۔ چہرے پر کئی موٹی پتلی جھریاں اور نچلے تمام دانت غائب۔ آنکھوں کی چمک کے اوپر ایک بے رنگ سا پردہ پڑا ہوا تھا جس کے پیچھے سے ان کی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی پُتلیاں تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ گردن کی جلد کئی اطراف سے لٹک کر گلے کے درمیان والی دو مرمری ہڈیوں کے بیچ میں جمع ہو رہی تھی۔ باہر کی طرف ابھرا ہوا زخرہ بولتے وقت اوپر نیچے ہلتا اور جب بات کرتے وقت وہ جانے کیا نگلتے تو ان کی صورت پر عجیب طرح کی مظلومیت چھاجاتی۔

انہوں نے پرانا ڈھلا ڈھلایا لباس پہنا ہوا تھا۔ چھدرے بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کی ہوئی تھی۔ چہرے پر ٹھوڑی کی بائیں جانب ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا چپکا ہوا تھا۔ شاید سفید ڈاڑھی کی زیادہ اچھی حجامت کرنے کی کوشش میں انہوں نے بلیڈ سے ذرا سی جلد چھیل لی تھی۔

اس دن میری کوئی ریکارڈنگ تھی ریڈیو میں۔ میں کمرے میں بیٹھی اپنے اسکرپٹ پر نظر ثانی کر رہی تھی۔ میز کی اس طرف پروگرام ایگزیکٹیو سکینہ صاحب بیٹھے تھے اور میری

نشست سے کچھ فاصلے پر شرما جی تھے۔ شرما جی پروڈیوسر تھے۔ وہ دونوں کسی نکتے پر کافی دیر سے گفتگو کر رہے تھے۔

"نمسکار جی" ایک آواز نے جو ضرورت سے کچھ ذرا سی بلند تھی یکبارگی ہمیں سر اوپر اٹھانے پر مجبور کیا۔

"یہ میرا بارہواں چکر ہے۔ قاعدے سے آپ لوگوں کو مجھے ہر تیسرے مہینے بک کرنا چاہئے۔ لیکن ..."

انہوں نے سلام کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا اور کچھ پل کے لیے خاموش ہو گئے۔ میں سکینہ صاحب اور شرما جی کی طرف دیکھنے لگی کہ وہ انہیں پاس کی میز کے اس طرف پڑی کرسی پر بیٹھنے کو کہیں، مگر وہ دونوں چُپ چاپ انہیں دیکھتے رہے۔

"آپ لوگوں کو میری قدر نہیں ہے نا ...... زمانہ بدل گیا ہے ..." انہوں نے پروڈیوسر صاحب کی کرسی کی پشت پر ہاتھ ٹکا دیا۔

"ادھر وہ اردو سیکشن والے بھی مجھے پتہ نہیں کیوں ٹالتے رہے ہیں۔ کوئی آفاقی صاحب ہیں ...... جانے کیوں ...... انہیں شاید میرا نام پسند نہیں ......"

انہوں نے ایک ہی سانس میں کہا اور کچھ دیر کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

"ایسا کچھ نہیں ہے کنول جی ......" سکینہ صاحب کھسیانی سی ہنسی ہنس کر مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ریڈیو میں یہ سب نہیں چلتا۔" شرما جی نے کچھ شرمندہ سا ہو کر کہا اور مجھے دوبارہ دیکھ کر پھر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"میرا نام صبیحہ ناز ہے ...... میں اکثر بلوائی جاتی ہوں ...... اردو سیکشن میں۔ وہاں رینو کا جی ہیں، وہی بک کرتی ہیں ......" میں نے موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے کہا۔

یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ :

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

سکینہ صاحب نے انہیں دیکھ کر ابرو جھکا کر اور نتھنے پُھلا کر کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگے۔

"تو پھر کیا ہے جناب۔ میں کیا سمجھوں۔ مجھے کچھ تو سمجھنا ہی چاہیے نا، دل کو تسلی دینے

کی خاطر، ایک وجہ میری سمجھ میں یہ بھی آئی..... فارسی کا ایک سادہ سا شعر ہے:

باقیٔ ایں گفتہ آید بے زباں
درد دل ہر کس کہ دارد نورِ جاں

اب اگر آپ کی سمجھ میں کوئی وجہ آتی ہو تو مجھے بتادیں کہ میں آئندہ کے لیے یاد رکھوں۔"

"کم از کم ایسی وجوہات ہرگز نہیں ہیں جیسی آپ سوچتے ہیں" شرما جی بولے "میں خود تو اس طرح نہ سوچتا ہوں نہ کبھی سوچا ہے۔ مگر دیکھتا ہوں کہ ابھی بھی کئی لوگ ایسی ذہنیت کے ہیں جیسے تب تھے۔ جنھوں نے دلوں کے ٹکڑے کیے مٹی کو بانٹ دیا۔"

کنول جی کھڑے کھڑے بولتے رہے۔ مجھے بہت خراب لگ رہا تھا کہ میں بیٹھی ہوں اور یہ بزرگ کمرے میں کرسیاں ہوتے ہوئے بھی کھڑے ہیں۔ اور میں خود انہیں بیٹھنے کو کہنے کا کوئی حق نہیں رکھتی تھی۔

"میرا کسی سے کوئی جھگڑا ہے نہ گلہ۔ میں تو اسے اپنا حق سمجھتا ہوں۔ ابھی ابھی جو شعر میں نے پڑھا فارسی کا..... آپ میں سے کتنے لوگ ہیں جو لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ مجھے دکھ نہیں ہوتا؟ میں نے زندگی کا بہترین وقت ان زبانوں کو پڑھنے میں گذارا ہے۔ عربی اور سنسکرت بھی جانتا ہوں اور مہارت ہے مجھے ان سب زبانوں پر..... کیوں آپ..... میرا مطلب ہے زبانیں کیوں تعصب کا شکار ہوں۔ یہ تو علم ہے اور علم کوئی بھی ہو برا نہیں ہوتا..... علم تو علم ہوتا ہے۔ اپنی تاریخ کے حوالے سے ہی سہی..... ایسے پروگرام تو ہو ہی سکتے ہیں جن سے کچھ استفادہ، کچھ علمیت آج کی نسل حاصل کر سکے۔ مگر آپ لوگوں کو ایسے پروگرامز کے لیے فرصت ہی نہیں۔" کنول جی ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔ اور اپنی بے ترتیب ہوتی ہوئی سانسوں کو قابو میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

"آپ یوں کریں، کلکرنی صاحب ابھی کمرے میں آنے والے ہیں۔ آپ ان سے مل لیجئے۔ آپ کے کئی مسئلے وہ حل کر دیں گے۔" سکینہ صاحب نے کنول جی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ یہاں بیٹھ جائیے۔" میں اپنی نشست سے کھڑی ہو گئی کہ اور اب تماش بین کی طرح حصہ لے کر خود کو اپنی ہی نظروں میں شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی میں۔

''وہ...... ٹلکرنی صاحب مختلف زبانوں کے مشترکہ الفاظ پر ایک مباحثہ کرنے والے ہیں۔اور ہمارے خیال میں آپ موزوں رہیں گے اس پروگرام کے لیے۔''

سکینہ صاحب نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے کُرسی پر بیٹھنے کو کہا اور کنول جی سے مخاطب ہوئے۔

''بس...... بس میں ایسا ہی پروگرام چاہتا ہوں...... بلکہ اس طرح کے پروگراموں کے سلسلے چلائے جائیں تو مجھ جیسے چند گنے چنے لوگوں کو جو اردو، انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت جانتے ہوں، خوشی ہوگی ہی۔ساتھ میں الگ الگ مزاج کے سامعین کو فائدہ بھی ہوگا۔'' کنول جی ایک دم سے خوش ہو کر بولے۔

''آپ لکھتے بھی ہیں۔''

میں نے اپنی کُرسی کے پاس کھڑے پوچھا۔

''جی ہاں۔ اور کیا۔ لکھتا ہی تو ہوں۔ نظم نثر دونوں۔ جب میں گارڈن کالج لاہور میں بی۔اے کا طالب علم تھا تو میں نے قومی مشاعروں میں حصہ لیا تھا۔ میں سناتا ہوں آپ کو کچھ اشعار'' کنول جی اپنی بیاض کھولنے لگے جواب تک ان کے پہلو سے لگی تھی۔

''ذرا ٹھہر جایئے کنول جی...... ریکارڈنگ ہو جائے ان کی...... اس کے بعد۔ آپ تو ہیں ہی۔ ٹلکرنی صاحب بس آنے ہی والے ہوں گے اور اس وقت ہمیں بھی اسٹڈیو خالی مل جائے گا'' سکینہ صاحب گھڑی دیکھ کر بولے۔

''آپ کو بیٹا اگر شاعری سے شغف ہے تو میں ضرور سناؤں گا۔ آپ آیئے ریکارڈنگ سے فارغ ہو کر۔''

''اچھا آپ یہاں بیٹھ جایئے۔ میں آتی ہوں ابھی'' میں نے کرسی ان کی طرف سرکائی اور باہر آ گئی۔

''دراصل یہ لوگوں سے جھگڑ پڑتے ہیں۔ہم نے مشاعروں میں بلوایا تھا انہیں کئی بار'' سکینہ صاحب بولے۔

''یہ لوگوں کا شین کاف درست کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور لوگ ان کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ تصحیح کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔اور پھر خوامخواہ'' انہوں نے مزید کہا۔

''میرے خیال سے ٹھیک کرتے ہیں۔''

جن لوگوں کا تلفظ ٹھیک نہ ہوا نہیں مشاعروں سے کیا مطلب۔ آپ نے بھی غور کیا ہوگا۔ اکثر لوگ، ذ، ز، ض، ظ کی جگہ ج کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تصحیح تو ہونی چاہئے۔ خود ہمارے بچے آپس میں غ، خ، ف، ق صحیح طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ مگر میں نے نوٹ کیا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ فون پر یا سامنے بات کرتے ہیں تو غ کو گ، خ کو کھ، ف کو پھ اور ق کو ک وغیرہ کہا کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے اسکول کے دوست اسی طرح الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ ان کی طرح نا بولیں تو ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے اگر ایسے میں کوئی انہیں درست کرنا چاہے تو...... "میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"...... میرے خیال سے آپ درست کہہ رہی ہیں۔ اصل میں کام بھی یہاں بہت ہوتا ہے۔ پھر پروگرام کے بارے میں انسان نہ تو رسک (Risk) لینا چاہتا ہے نہ تجربے کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے شاید جلد بازی سے کام لیتا ہے کہ کون اچھا فن کار کہلاتا ہے اسے ہی بک کیا جائے۔ پھر ہمارے سیکشن میں کبھی کبھار ہی دوسری زبان کے قلم کار کو مدعو کیا جاتا ہے۔"

سکینہ صاحب نے اسٹوڈیو کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔

ریکارڈنگ میں وقت لگا۔ لوٹی تو کنول جی کمرے میں اکیلے بیٹھے تھے۔ "فارسی سمجھتی ہیں۔" انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"جی ہاں کچھ کچھ تو...... شعر سمجھ سکتی ہوں۔" میں نے کرسی اپنی طرف کھینچی۔

"بھئی واہ...... اس سے بڑھ کر اور خوشی کی کیا بات ہوگی۔ اور عربی؟"

"جی...... سمجھ لوں گی۔"

"ہندی، سنسکرت؟"

"ہندی تو جانتی ہوں...... مگر سنسکرت تھوڑی سمجھانی پڑے گی آپ کو۔"

کنول جی قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ ان کے ہونٹوں کے ساتھ ان کی آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں۔

انہوں نے جھوم جھوم کر شعر پڑھے۔ کچھ اپنے کچھ دوسروں کے وہ علم وادب کا ایک جیتا جاگتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ مولانا روم سے شروع ہوئے اور حافظ، سعدی، فردوسی، رومی سے ہوتے ہوئے خیام کی رباعیاں، الف لیلیٰ کی کہانیاں، پھر شیکسپیئر، کیٹس، غالب، میر،

کالیداس، سورداس اور جانے کیا کیا سنایا سمجھایا...... کتنی لگن ہے، کتنے شوق اور خوشی سے۔

''جانتی ہو بٹیا، ملک کے ٹکڑے کیوں ہوئے؟'' وہ شعر کا ایک مصرع سنا کر مسکراتے ہوئے اچانک سنجیدہ ہو کر بولے۔

''کیونکہ...... کیونکہ لوگوں میں لالچ آگیا تھا۔ اور تب سے یہ لالچ بڑھتا ہی جا رہا ہے...... سوچتے ہیں یہ ریٹائرڈ بڈھا کس کام کا ہے۔ دیکھتا یہ ٹھیک سے نہیں ہے۔ سنائی اس کو ٹھیک سے نہ دیتا ہوگا۔ یادداشت اس کی کمزور ہو گئی ہوگی۔ پھر کسی کو کوئی فائدہ بھی کیا پہنچائے گا...... مگر ایسا نہیں ہے...... میں کسی اہم مقام پر نہ سہی۔ میں علم تو بانٹ سکتا ہوں۔ اور میرے نزدیک یہ سب سے اہم بات ہے...... اگر ملک کے ٹکڑے نہ ہوئے ہوتے تو کیا تم سب لوگ مجھے آنکھوں پر نہ بٹھاتے...... مگر تب بھی سب نے اپنا اپنا ہی سوچا تھا...... کتنی دیر زندہ رہا تھا وہ پھر...... بانی بن کر...... کل چھ مہینے نا......؟ پھر؟ یا ہم ہی صبر کر لیتے۔ اُسے چھ مہینے کی بادشاہت دے دیتے تو کیا فرق پڑ جاتا......؟ بٹوارہ تو نہ ہوا ہوتا...... اور ہماری...... ہم سب کی زبان پر کسی ایک کو اپنا حق جمانے کا حق نہ ہوتا۔ اور دوسرے اسے دوسروں کی زبان کہہ کر دوسری نظر سے نہ دیکھتے...... ''کنول جی نے ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھری۔

''دِل دکھتا ہے بٹیا...... میری اہلیہ برسوں ہوئے چھوڑ گئی۔ اردو، فارسی جانتی تھی۔ میرے شعر سمجھتی تھی سراہتی تھی۔ میرے علم کی قدر کرتی تھی۔ بچوں کو ان زبانوں سے کوئی مطلب ہی نہیں...... اپنے کاروبار اور انگریزی میں مگن ہیں۔ اور وہ تو پھر بھی مجھ سے ہندی اردو میں بات کر لیتے ہیں مگر پوتے پوتیاں انگریزی کے بغیر کچھ بولتے ہی نہیں۔ رنج ہوتا ہے...... میری بینائی کچھ ایسی خراب نہیں ہیں...... سماعت بھی ماشاءاللہ درست ہے۔ یادداشت تیز ہے...... آپ کوئی واقعہ پوچھ لیں اسکول سے...... یونیورسٹی سے...... بس انسانیت ختم ہو گئی ہے لوگوں کے اندر سے...... مجھے میری زندگی میں ہی مردہ انسان کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں...... ''کنول جی کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

''میری اہلیہ کا نام تھا کنول...... میں نے تخلص کر لیا۔ زندہ ہوتی تو میری ہی طرح رنجیدہ رہتی۔ خیر! ملکر رنج بانٹ لیتے۔ مگر پھر بھی میرا دل اس بات کو قبول نہیں کر پاتا کہ میری یہ زبانیں جن میں، میں نے فرداً فرداً ایم۔ اے کی ڈگریاں لیں، اب میرے اپنے ہی دیس سے ختم ہو جائیں گی اور جو ان کو جاننے والے ہیں زندہ ہوتے ہوئے بھی مُردوں کی

طرح خاموش بیٹھے رہیں گے۔اپنے ہی وطن میں آپنے ہی ہم وطنوں سے انہیں غیروں کا سا برتاؤ ملے......"

کنول جی کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ سوچ رہے ہوں جیسے...... جیسے وہ ابھی بہت سی اور باتیں کرنا چاہتے ہوں۔ جیسے انہوں نے مدّتوں بعد کسی سے اتنی باتیں کی ہوں۔اور ابھی کچھ اور کہنا ہو۔ کسی نے کمرے کے دروازے سے جھانک کر کہا کہ کلکرنی صاحب آگئے ہیں۔ مگر کنول جی نے دروازے کی طرف دیکھا تک نہیں۔وہ باہر دیکھتے دیکھتے مسکرادیئے پھر میری طرف مڑ کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ میں نے یاد دلایا کہ کلکرنی صاحب سے ملاقات ضروری ہے ان کی۔

"کلکرنی صاحب تو کل پرسوں بھی بیٹھیں گے اپنی کُرسی پر...... مگر تم جیسا سامع جو اتفاق سے ملا ہے وہ کل جانے کہاں ہو...... خوش رہو...... علم حاصل کرنے کی تمہاری تمنائیں پوری ہوں۔" وہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ لیے ہوئے بولے۔

"یہ میرا پتہ ہے...... یہ فون...... جب چاہیں تشریف لائیں۔"

"واقعی؟" انہوں نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

"آیئے میں آپ کو کلکرنی جی کے کمرے تک چھوڑ دوں" میں نے اٹھتے ہوئے کہا...... وہ بھی کھڑے ہوگئے۔انہوں نے پتلون کی پچھلی جیب سے ایک پرانا چھوٹا سا کنگھا نکالا اور بالوں پر پھیرنے لگے۔ پھر کمرے سے باہر آتے ہوئے انہوں نے کھڑکی کے شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر مانگ نکالی اور مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ ایسا ہی کرنا چاہئے نا؟۔ میں بھی جواباً ہنس دی تو انہوں نے کنگھا واپس جیب میں ٹھونس کر دونوں ہاتھوں سے شانے جھاڑے اور بالکل سیدھے ہو کر چلنے لگے...... جب وہ کلکرنی صاحب کے دروازے پر پہنچ کر کھنکارے تو میں 'بیسٹ آف لک' (Best of Luck) کہہ کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی چل پڑی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کنول جی کا ہیولا میرے آس پاس ہی کہیں میرے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

□□

"قصے" نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

اماں

شام رات میں بدل گئی مگر دروازے کی گھنٹی ابھی تک نہیں بجی تھی۔ کچھ دیر پہلے آسمان کے کنارے جو نارنجی نظر آرہے تھے، اب گہرے سرمئی ہو گئے تھے۔ اندھیرا تقریباً ہو ہی چکا تھا۔ میں کھڑکی سے پلٹ آئی۔

قالین پر اماں بے خبری سے سو رہی تھیں، ایک ہاتھ کا سرہانا بنائے اور دوسرا ہاتھ اپنے موڑے ہوئے گھٹنوں پر رکھے۔ موٹے محدب شیشے میں بجلی کے بلب کا ننھا سا عکس چنگاری سا روشن تھا۔ ناک میں پڑی سونے کی بڑی سی لونگ، نتھنوں کے زیروبم کے ساتھ اوپر نیچے ہلکورے لے رہی تھی۔ ان کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے میں رہ رہ کر سنائی دے رہے تھے۔

"کیسی ہو بٹیا؟"

کوئی دو ایک گھنٹے پہلے اماں آتے ہی مجھ سے لپٹتی ہوئی بولی تھیں۔

"تم کہاں کھو جاتی ہو میری بچی۔"

مجھے گلے سے لگا کر اماں چشمے کے پیچھے سے چپکے چپکے رونے لگیں۔ ان کے بالوں سے پرانے گھی کی روایتی بو آرہی تھی۔ میں نے ان کے سر پر ان کی سوتی ساڑی کا آنچل سنوارا۔ جھریوں کے جال میں پوشیدہ آنکھوں کو تلاش کر کے اپنی آنکھیں ان میں ڈال دیں اور مسکرانے لگی۔ ان کے سخت سخت ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں کرسی تک لے آئی۔ ان کے ہاتھ بہت گرم تھے۔

"مایا کہاں ہے بٹیا؟"

اماں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ مایا ان کے رشتے کی بہو تھی، جو میرے یہاں گھر کے کام میں ہاتھ بٹانے آتی تھی۔

"وہ تو چلی گئی اماں۔ آج جلدی جانا تھا اسے۔ یہ بخار کب سے ہے آپ کو؟" میں نے

قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تین دن سے تڑپ رہی ہوں تمہیں دیکھنے کو۔ جب سے تمہیں ملی ہوں، مجھے اپنی بیٹی کی یاد آتی رہتی ہے۔ پھر تمہارا چہرہ یاد آتا ہے...... تمہاری جیسی تھی۔ بچے کو جنم دیا...... مردہ لڑکے کو......اور بس...... آپ بھی...... ختم ہو گئی۔" اماں رو پڑیں۔

"ارے ارے اماں......ایسے نہیں...... سردی لگ گئی ہے آپ کو...... میں آپ کے لیے قہوہ بنا لاتی ہوں اور دوا کی ایک ٹکی بھی دیتی ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟"

"تم کیوں بناؤ گی...... میں بناتی ہوں...... مایا تو ہے نہیں۔"

"نہیں، بس دو منٹ میں۔ آپ پیر اوپر کر کے آرام سے بیٹھ جائیں۔ فرش ٹھنڈا ہے۔"

اچانک سردی بڑھ گئی تھی۔ ابھی ہفتہ بھر پہلے اماں آئی تھیں تو ساڑی پر بلاؤز بھی سوتی تھا...... نہ شال نہ سوئٹر...... آج اماں نے موٹے موٹے موزے، اونی بلاؤز، شال...... سب کچھ پہن اوڑھ رکھا تھا، پھر بھی سردی سے کانپ رہی تھیں۔ ہفتہ بھر پہلے کھلی کھلی سی لگ رہی تھیں۔

"میں مایا کی ساس ہوں۔ وہ آج کام پر نہیں آئے گی۔ کسی نے اس کے بیٹے کو پیٹا ہے۔ اسے لے کر اسپتال گئی ہے۔" پہلی بار اماں مایا کے ناغے کی اطلاع دینے آئی تھیں۔

"کوئی فکر کی بات تو نہیں ہے نا؟" میں نے جلدی سے پوچھا کہ لاولد مایا نے جانے کہاں سے یہ بیٹا حاصل کیا تھا۔

"نہیں نہیں، سب ٹھیک ہے......وہ گھبرا جاتی ہے نا...... لاؤ میں کچھ کام کر دوں۔" میں نے اماں کا جملہ سنا، انہیں غور سے دیکھا...... پیار آ گیا مجھے ان پر۔

کوئی ساڑھے چار فٹ کا قد...... رنگ گورا...... بیس بائیس بالوں کو چھوڑ کر سب سفید......ماتھے پر بڑی سی سرخ بندی۔ تنی ہوئی نسوں سے بھری سوکھی کھال والی کلائیوں میں درجن بھر کھنکتی ہوئی چوڑیاں، ناک میں سنہری لونگ، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں...... کسی ہلکے رنگ کی نرم نرم سوتی ساڑی میں لپٹا ہوا بلا سا بدن۔ بولتیں تو نظر آتا کہ دہانے کے اندر صرف اوپر دونوں اطراف دو دو عدد جھولتے ہوئے دانت لٹک رہے ہیں۔ مسکراتیں تو نچلا ہونٹ مسوڑے کے اندر کی طرف مڑ جاتا۔ ٹھوڑی پر ضرب کی شکل میں، کئی لکیریں اور چہرے پر جھریاں ہی جھریاں تھیں۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ خاصی پھرتی سے باورچی خانے کی طرف بڑھیں اور سنک کے

پاس کھڑی ہوگئیں۔

"وِم (Vim) کہاں ہے بٹیا؟" اپنا چھوٹا سا سر ادھر ادھر گھماتے ہوئے بولیں اور ایک پلیٹ ہاتھ میں لے لی۔

"ارے اماں...... آپ...... چھوڑیئے آپ۔ ادھر آیئے...... ایسے کوئی زیادہ نہیں ہیں برتن۔" میں نے ان کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی اور ان کے شانے پکڑ کر انہیں الٹے چار پانچ قدم چلا کر کرسی پر بٹھادیا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔ میں بہت کام کرتی ہوں بٹیا۔ ابھی بھی آرہی ہوں کام سے۔ میں...... اپنے کنہیا کا مندر دھو کر...... یہ پیچھے والا مندر...... میں ہی تو دھوتی ہوں۔ دو سو روپے ملتے ہیں۔ سب پیار سے بلاتے ہیں مجھے۔ ہاں۔"

"ٹھہریئے ذرا میں چائے بنالاتی ہوں۔" وہ ذرا سا رکیں تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں رہنے دو۔"

"مجھے بھی تو پینی ہے۔"

"کیوں کرتی ہیں کام...... یہ تو آپ کے آرام کے دن ہیں۔"

تو کیا کروں بیٹا کون کھلائے گا مجھ بڑھیا کو؟" انہوں نے بسکٹ چائے کی پیالی میں ڈال دیئے اور چمچہ چلاتے ہوئے بولیں۔

"کیوں، بابا کچھ کام نہیں کرتے؟" میں نے ان کی بڑی سی بندی پر آرہے بالوں کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں بابا کرے ہیں کچھ...... میں نہ کھلاؤں تو کچھ کھائیں بھی نہ، پڑے پڑے بولتے رہیں، بس۔"

"اور بچے تو ہیں نا؟"

کھوب ہیں کھوب...... کوئی بانجھ نا ہی ہوں میں۔ پوتے پوتیاں ہیں۔ بس ایک...... بیٹی تھی...... وہ...... وہ...... تیری جیسی تھی وہ۔" اماں کی آواز بھرا گئی، مگر وہ مسکرا کر مجھے دیکھنے لگیں۔

"اچھا، اماں چائے پیجئے...... کیا کرتے ہیں بچے؟"

"دکان ہے۔ کپڑے سیتے ہیں۔ ان پر پھول بیلیں کاڑھتے ہیں۔ پوتے بھی کام کرتے ہیں میرے...... اتنے لمبے لمبے، سندر ہیں...... کوئی میرے طرح تھوڑے ہیں...... تمہارے بابا پر گئے ہیں۔" چشمے کے عقب سے اماں کی آنکھیں کچھ پل کو روشن دکھائی دیں۔

"تو پھر اب...... وہ لوگ کہاں ہیں؟"

''ارے کہاں ہوں گے ...... وہیں میرے گھر میں ...... سب اپنے اپنے کام میں مگن۔ میں تو سب کا منہ دیکھ لوں جب جاؤں کام پر ...... تیرے بابا ہفتوں نہ دیکھیں کسی کو۔ دن بھر اندر ہی گھسے رہیں۔ یا کبھی شام کو باہر نکل جاویں ...... گھومیں، پھریں۔''

اماں کھوکھلی سی ہنسی ہنس دیں۔ چائے پیتی رہیں۔ باتیں کرتی رہیں۔ میرے بچے اسکول سے آگئے۔ اماں کو دیکھا تو مسکرائے۔ اماں کرسی سے اٹھیں۔ باری باری گلے لگایا دونوں کو۔''

''آؤ کہانی سناؤں گی ...... آجاؤ!''

''ذرا ہاتھ منہ دھولیں یہ۔ چینج (Change) کر کے آئیے۔ یہاں اماں کے پاس۔'' وہ کمروں میں جانے لگے تو میں نے آواز دے کر کہا۔

دونوں معمول سے کچھ کم وقت میں کپڑے تبدیل کر کے میرے پاس آبیٹھے اور نہایت دلچسپی سے اماں کو دیکھنے لگے۔ چھوٹے اپنی کرسی اماں کے قریب لے گئے۔ خاصی بے تکلفی سے انہوں نے اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کی پھولی ہوئی نسوں پر کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ انگلی رکھتے اور مسکرا کر بھائی کی طرف دیکھنے لگتے۔ انہوں نے پہلی بار ایسی ضعیف انسان کو دیکھا تھا۔ اماں ان سے باتیں کرنے لگیں۔ وہ بھی کچھ سوال کرتے۔ میں کسی کام سے اندر آگئی۔ کچھ دیر بعد جب باہر واپس آئی تو دروازے پر ٹھہر جانا پڑا مجھے کہ اماں بڑے دلچسپ انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر بچوں کو کچھ سمجھا رہی تھیں۔

''اتنے اماں؟ اتنے؟'' میرے چھوٹے بیٹے کرسی پر کھڑے ہوگئے اور اپنے ٹریک سوٹ کے ڈھلکتے ہوئے پائجامے کا الاسٹک اوپر کو کھینچ کر اپنا ہاتھ سر سے اونچا اٹھا کر بولے۔

''ہاں۔'' اماں زور سے سر ہلا کر بولیں۔

''اتنے اتنے لمبے۔'' اماں نے دونوں ہاتھ اوپر کیے۔

''لال لال ان کا منہ۔ ٹوپ پہنے۔ لمبے لمبے بوٹ گھٹنوں تک چڑھائے گھومتے تھے۔ یو بڈی (You buddy) یو بڈی (You buddy) کہتے تھے۔ ادھر بازار میں۔'' اماں نے مجھ پر نظر پڑتے ہی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور مسکرانے لگیں۔

''کہیے نا اماں کیا کہہ رہی تھیں؟''

''کچھ نا بٹیا ...... بچوں کو بتا رہی تھی ...... پرانی باتیں ...... سچی کہوں بی بی میں تو ...... ان دنوں ہی اچھا وکھت (وقت) تھا ...... نہ مہنگائی ...... نہ بھوک۔ ان کو آتی تھی حکومت چلانی ...... سب خوش ...... سلام کرتے تھے ہم ان کو۔'' اماں نے کھڑے ہو کر سلوٹ بجایا۔ میں مسکرانے

لگی۔ وہ زور سے ہنس دیں...... "ایسے......ہاں...... وہ خیال رکھتے تھے سب کا۔"
"اچھا اماں"؟ میں باورچی خانے میں چلی گئی۔
تھوڑی دیر بعد تالیوں کی آواز سنائی دی۔ جا کر دیکھا تو اماں رقص کرتی ہوئی گا رہی تھیں۔ دونوں باہیں دائیں طرف جھلاتیں، پھر ایک تالی بجاتیں پھر بائیں طرف بھی ایسا ہی کرتیں۔ پاؤں ایک ہی جگہ تھے۔ بچّے بھی تالیاں بجاتے ہوئے ان کے رقص کی نقل کر رہے تھے۔ اماں بھجن گا رہی تھیں:

تو رے بلہاری او مورے کنہیا　　درشن دے جا رے بنسی بجیا
کب تک راہ نہارے پنہاری　　دل کی نہ کہہ پائے لاج کی ماری
کیا کہیں لوگوا دیارے دیا　　تورے بل ہاری او مورے کنہیا
پل پل چھن چھن گن کاٹوں رتیاں　　شاما مورے کا سے کہوں من کی بتیاں
مار گئی ڈنک موہے پریم کی تتیا　　تورے بلہاری او مورے کنہیا

اماں جھوم جھوم کر گا رہی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑی تو گھوم کر ایک زور کی تالی بجائی اور ہنستی ہوئی کرسی پر آبیٹھیں۔ میں بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی، انہیں ناچتا گاتا دیکھ کر......
"بھجن بھی گاتی ہوں مندر میں۔" وہ شرما کر بولی تھیں۔
جب سے ہفتہ بھر گزر گیا۔ ایک بار اماں کا خیال آیا تو میں نے مایا سے خیریت پوچھی
دو تین دن سے مندر بھی نہیں آ رہی تھیں۔ مایا نے بتایا۔
شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔ مگر نہیں اماں کہیں نہیں گئی تھیں۔ اور اب کہیں جا کر نظر آئی تھیں۔ پتہ نہیں کتنے دن سے ان کی طبیعت خراب تھی۔
آج اماں بیمار تھیں۔ میں نے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے تو تپ رہے تھے۔ میں نے پانی میں ذرا سی ہری پتی، دار چینی کی چھوٹی سی قلم اور دو تین ہری الائچیوں میں زعفران کی دو پتیاں ڈال کر ابال دیں۔ شکر ملا کر اماں کو مگ پکڑا دیا۔ اماں نے مگ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور قہوے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگیں۔
"اچھی کھسبو (خوشبو) ہے۔" وہ مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی بولیں۔ ان کا چہرہ بخار کی تمازت سے گلابی ہو رہا تھا۔ ماتھے کی جھریوں کے بیچ کہیں سے پسینے کی خوردبینی بوندیں اٹھ کر قطرے کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھیگی بھیگی سی مہین لکیریں بن کر واپس جھریوں میں گم ہو جاتیں۔ اماں کرسی پر ایسے بیٹھی تھیں جیسے توازن برقرار نہ رکھ پا رہی ہوں۔ مگ ان

کے ہاتھوں میں ہلکے ہلکے چھلک بھی رہا تھا۔ مگر انہوں نے خاصی کوشش سے مگ کو سنبھال رکھا تھا اور خود کو بھی، شاید ایسے ہی انہوں نے اپنی زندگی کو بھی سنبھال رکھا تھا۔ میں نے اماں کو ڈسپرین کی ٹکی کھلا دی۔

"اماں! لیٹیں گی کیا۔؟" میں نے یونہی پوچھ لیا تھا کہ شاید وہ گھر جانا چاہ رہی ہوں۔

"ہاں۔ بی بی۔ کہاں لیٹوں" ؟ وہ ٹھنڈے سخت فرش کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"یہاں تھوڑی...... یہ تو ٹھنڈا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے انکا ہاتھ پکڑ لیا ڈرائنگ روم میں لے جا کر قالین پر لٹا دیا۔ کچھ سیکنڈ میں ہی وہ بے خبر سو گئیں۔ ایک ہاتھ کا سرہانہ بنائے اور دوسرا ہاتھ اپنے موڑے ہوئے گھٹنوں پر رکھے۔ ان کے چشمے میں نہایت ننھا سا بلب چمکنے پر بضد تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ اماں کے گھر والے اماں کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ وہ میرے یہاں ہیں۔ بیٹے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ بابا انہیں ڈھونڈنے نکل پڑے ہوں گے۔ پہلے مندر کی طرف جائیں گے پھر شاید پوچھتے ہوئے یہاں آجائیں۔ اب تک آ جانا چاہئے تھا انہیں۔ کیا اماں کو جگا کر رکشے پر روانہ کردوں؟ میں سوچنے لگی۔

"اماں۔" میں نے دھیرے سے پکارا۔ مگر اماں بدستور سوتی رہیں۔ ان کی نیند میں مخل ہونے کا جی نہ چاہا۔ جب کوئی آئے گا جگا دوں گی۔ میں نے سوچا۔ اور اماں کے پاس سے ہٹ گئی۔ رات ہولے ہولے اتر آئی تھی۔ میرے کان دروازے کی گھنٹی پر لگے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بوندیں برآمدے میں رکھے بڑے سے گملے میں اگی چمیلی کے پتوں پر ٹپ ٹپ برس کر ترنم سا پیدا کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ان آوازوں میں کال بیل کی ایک مختصر سی آواز ابھری۔ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میں دروازے تک پہنچ گئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو کوئی بھی نہ تھا۔ گھنٹی بھیگی ہوئی تھی۔ دراصل بارش کا کوئی قطرہ گھنٹی میں سے گزر کر ایک لمحہ کے کسی حصے میں دونوں تاروں کو جوڑ کر سوئچ (Switch) کا کام کر گیا تھا۔

اندر اماں چپ چاپ سوئی تھیں۔ نرم گرم قالین پر۔ باہر بارش تیزی سے برستی جا رہی تھی۔ اماں کو لینے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اگر کسی کو آنا ہوتا تو وہ گھر سے نکالا ہی کیوں کرتیں۔

آشنہ ۔ کراچی

("مژگاں" کلکتہ)

□□

مٹّی

"ایک کمبل مجھے دو گے ؟" کشن لال نے ہلال احمد کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھ کر کہا کہ اس کی آنکھوں میں چھپی التجا اور بے یقینی بیک وقت واضح ہو گئی۔

اگر وہ کچھ اور وقت صبر سے کام لینے کی کوشش کرتا تو شروع دسمبر کی اس یخ بستہ رات میں وہ ایک پل کے لیے بھی جھپکی نہ لے پاتا۔ کیونکہ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اور کسی طرح کچھ وقت کے لیے سو جانا چاہتا تھا۔ یہ بات دوسری تھی کہ اسے اپنی درخواست کے رد ہو جانے کا نوے فی صد یقین تھا۔ باقی دس فی صد اس نے شک کے حوالے کر دیا تھا۔ امید بھرے اس شک، کے جو صرف ایک انسان ہی دوسرے انسان پر کر سکتا ہے۔

مارے سردی کے کشن لال کی سانولی رنگت گہرا گئی تھی۔ ہونٹ تقریباً سیاہ ہو گئے تھے۔ اس کی گرم جیکٹ کے سارے بٹن بند تھے۔ اور اندر سے ایک بغیر آستین، اور ایک پوری آستین والا سویٹر پہننے کے باوجود وہ سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ کچھ ہی مہینے پہلے نیا نیا ڈیوٹی پر تعینات ہوا تھا۔ اور اس علاقے میں اُسے ہنگامی حالات میں بھیجا گیا تھا۔ اس خطے کے موسم کا اسے بالکل تجربہ نہ تھا۔ اس لیے کچھ دن پہلے تک وہ بیماری جھیلتا رہا اور ابھی تک وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

کشن لال نے پنڈلیوں تک تنے ہوئے موزوں کو اور اوپر کھینچا، مگر اس کا ہاتھ ہٹتے ہی وہ واپس اپنی جگہ پر آگئے۔ اس نے اپنی سبزی مائل منگیا رنگ کی وردی کے کالر کی سلوٹ سیدھی کر دی۔ اور ٹوپی جو پہلے ہی کانوں کو سر تک ڈھک رہی تھی، اسے اور اچھی طرح سر پر جمانے کی کوشش کرتے ہوئے ہلال احمد کی طرف منتظر مگر بے تاثر آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ ہلال احمد بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے باوجود سخت سردی کے گریباں کھلا چھوڑ رکھا تھا۔

اس کی وجیہہ چھاتی کے سیاہ بالوں پر اس کے زخمی ہونٹوں سے ٹپکے ہوئے خون کی بوندیں جم چکی تھیں۔ وہ ٹانگوں پر کمبل پھیلائے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ کمبلوں کی لمبائی اس کے دراز بدن کو پوری طرح ڈھکنے کے لیے ناکافی تھی۔

"یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو۔" اس نے تم پر زور دے کر چہرے پر حیرت طاری کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے علاوہ یہاں دوسرا ہے ہی کون۔" یہ کہتے ہوئے کشن لال اٹھ کر آہستہ چلتا ہوا سلاخوں کے پاس آگیا۔ اس نے سلاخوں پر ہاتھ رکھ کر اندر ایک نظر غور سے دیکھا سلاخیں بہت ٹھنڈی تھیں۔ اس نے ہاتھ واپس جیبوں میں ٹھونس لیے۔

"کیوں تمہیں یہ دو نظر نہیں آرہے؟" ہلال احمد نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے داہنی بائیں جانب اشارہ کر کے کہا۔

"تمہیں بھی تو نظر نہیں آرہے...... تمہیں نظر آتے تو تم ان کے جسموں سے کمبل نہ کھینچتے۔" کشن لال نے فرش پر ایک ہی جگہ پاؤں بدل بدل کر اچھلتے ہوئے کہا۔

"یہ جسم ہیں؟ انہیں جسم کہتے ہو تم...... یہ جسم تو کب کے مٹی ہو گئے۔" ہلال احمد اپنی آواز کا کرب دبا نہ سکا۔

"جانتا ہوں......" کشن لال نے آہستہ سے کہا۔

"خاک جانتے ہو۔ کچھ جاننے کے لیے آدمی کا انسان ہونا لازمی ہے۔ مجھے تو تم میں انسانوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ تم ایک بے حس درندے سے کسی طرح کم نہیں ہو...... تم پتھر ہو...... تم سب پتھر ہو۔" اس نے غصے اور نفرت سے کہا اور منہ اتنی تیزی سے دوسری طرف پلٹا کہ پتھریلی دیوار سے اس کا رخسار چھل گیا۔

یہ تو وہ اتفاق سے ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ ورنہ آج تک اس نے اس سے زیادہ خطرناک کارنامے انجام دئے تھے۔ مگر بغیر کسی کے ہاتھ آئے اپنے پوشیدہ ٹھکانوں پر پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا تھا۔ آج بھی وہ اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ رہا تھا کہ لبِ سڑک ایک زخمی راہگیر کو پڑا دیکھ کر رک گیا اور وہ اسے کندھے پر لاد کر تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ کسی طرف سے ایک دس بارہ سالہ لڑکا سہا ہوا آکر اس کے ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس نے گھبرا کر لڑکے کو اپنے اور قریب کر لیا۔

''بھیا...... بچالو...... وہ مجھے پکڑ......'' وہ ہانپتا ہوا بات مکمل نہ کر سکا۔ کیونکہ اتنی دیر میں بہت سارے بندوق برداروں نے انہیں گھیر لیا۔

یہ الگ بات ہے کہ انہیں جہاں لے جایا گیا۔ یہ ان تینوں میں سے کسی کی منزل نہ تھی۔ نہ ہی یہ راستہ ہلال احمد نے چنا تھا جس پر چلتے ہوئے وہ پکڑا گیا تھا۔ وہ تو میکینکل انجینئرنگ کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ اس نے اور اس کے والدین نے مل جل کر یہ خواب دیکھا تھا۔ بہت چھوٹا سا تھا تو اپنی ٹرائی سکل کے ساتھ اپنے اور دوستوں کے ننھی منی مشینریوں والے کھلونوں کی مرمت کیا کرتا۔ کچھ بڑا ہوا تو گھر میں کبھی مرغیوں کا ڈربہ بنا رہا ہے کبھی بجلی کی تاریں درست کر رہا ہے، نلوں کو ٹھیک کرتا، سلائی کی مشین، گھڑیاں، اس طرح کی تقریباً ساری ہی خراب اشیاء کو کھول کر کارآمد بنا دیتا۔ والدین کو اس کا یہ رجحان پسند آیا۔ داخلے کے امتحان میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا...... کالج جوائین کیا مگر......

کچھ ہی مہینے پہلے کی بات ہے۔ درخت ابھی ابھی اپنی رنگین باہوں سے برف جھاڑ کر لہرانے لگے تھے۔ بہار کا موسم شروع ہی ہوا تھا۔ بادام کے پیڑ ننھے ننھے ہرے پتوں اور گلابی شگوفوں کی چنر اوڑھے شرمائے شرمائے سے جھکے جا رہے تھے۔ ہد ہد جانے کس نگر سے ہجرت کر کے آتے اور چناروں کی کھوکھلی ٹہنیوں پر اپنی لمبی چونچ سے ٹک ٹک آوازیں پیدا کرتے ہوئے چھید کر کے جانے کن ننھے ننھے کیڑوں کے سکون میں خلل کا باعث بنتے اور فیروزی رنگ کے دھلے دھلائے نکھرے نہلائے آسمان میں ایک لمبی سی اڑان بھر کر دوبارہ اسی کام میں، نئے انہماک سے مشغول ہو جاتے۔ نرم نرم دھوپ ہری ہری دھرتی کو اپنی کرنوں سے گدگدا دیتی اور گھاس کے تنکے لہک لہک کر فضا میں اپنی مہک بکھیر دیتے۔

سہ پہر کا وقت تھا کہ آسمان کی نیلاہٹ نگلنے جانے کس کس طرف سے نیالے، کالے گھنے گرجتے بادلوں کے ریلے اس طرح چھائے کہ اچھی بھلی سہ پہر میں ڈھلتی ہوئی شام کا سماں معلوم ہونے لگا۔ فضا میں میلی سی سیاہی مائل زرد روشنی پھیل گئی۔

ہلال احمد اسی وقت کالج سے لوٹا تھا۔

''آگیا میرا چاند'' اس کی ماں نے نظروں سے اس کے چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا تھا۔

''اگر آپ کہتیں آگیا میرا ہلال تو مجھے محسوس ہوتا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں۔

''وہی تو کہا......'' وہ اس کے بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے ہوئے بولیں۔

"چاند ہلال ہی تو ہوتا ہے...... جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہارا چوڑا ماتھا دیکھ کر تمہارے داداجان نے یہ نام رکھا تھا۔ کہتے تھے بڑا آدمی بنے گا چاند کی طرح چمکے گا...... خاندان کانام روشن کرے گا...... انشااللہ"

"توکیامیں یہ سب نہیں جانتا" ہلال احمد نے مصنوعی ناراضگی ظاہر کی۔

"اوہ میں تو بھول ہی گئی۔ کہ تم جانتے بھی ہو۔" دونوں ہنس پڑے۔

"آج میں نے تمہاری نمکین چائے کے لیے پاپنور سے باقرخانیاں منگائی ہیں۔" امی نے کہا۔

"وہاں تو حالات...... ؟" اس کی آواز میں ہلکی سی سنجیدگی گھل گئی۔

"کل سے بہتر ہیں...... تمہارے ابا کو دفتری کام سے اس طرف جانا تھا۔"

ہلال احمد نے باقرخانی کا ایک کونا توڑ کر چوڑے منہ والی چھوٹی سی بغیر دستے کی پیالی میں بھری گلابی گلابی چائے میں ڈبویا ہی تھا کہ باہر میگافون پر زور زور سے کچھ اعلان سنائی دیا۔ ہلال احمد باہر کی طرف بھاگا۔

"سب لوگ گھروں سے نکل آئیں...... کچھ شرپسندوں کی تلاش ہے گھروں کی تلاشی لی جائے گی...... ہم پانچ منٹ کا وقت دے رہے ہیں۔"

"یااللہ...... ادھر بھی......" اس کی امی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

لوگوں نے جلتے چولہے بُجھادئے۔ ادھ پکی ہانڈیاں، ادھ پیئے پیالے، کام آرام سب کچھ بیچ میں چھوڑ، باہر نکل آئے۔ سارا محلّہ پلک جھپکتے ہی خالی ہو گیا۔ لوگ سامنے کے بڑے میدان میں جمع ہو گئے۔ یہ میدان دھان کے سنہرے خوشوں کو پتھر کی بڑی بڑی آڑی رکھی ہوئی اوکھلیوں پر پٹخ کر دانے الگ کرنے اور پھر پھٹک کر بوروں میں بھرنے کے کام آتا تھا۔ ادھر ادھر بکھری ہوئی اوکھلیاں کھیل کے وقت بچوں کے بھی خوب استعمال میں آتیں۔ کبھی ان کے پیچھے چھپا جاتا کبھی ان کی نشست بنادی جاتی۔ تہواروں، عیدوں، تقریبوں پر لڑکیاں، بالیاں وہاں مل کر 'رُف اور وَن وُن جیسے لوک گیت گاتیں۔ چاندنی میں ناچتیں' اٹھکھیلیاں کرتیں۔

ہلال احمد بھی اپنے والدین کے ہمراہ گھر سے باہر آگیا۔

اندر گھروں کی تلاشی ہو رہی تھی۔ تلاشیاں لینے والے ایک گھر کبھی دوسرے گھر میں

آ جا رہے تھے۔ ایک وردی پوش جب ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں جانے والا تھا تو اس کی پتلون کی پچھلی جیب میں سے سونے کی ایک زنجیر جھانک رہی تھی۔ وہ جلدی میں شاید اسے اچھی طرح ٹھونس نہ پایا تھا۔

"میری...... میری...... بچّی کی ہے...... اس کی شادی کے لیے۔" ہلال احمد کا ہمسایہ غلام حسن زور سے بولا اور بھاگ کر وردی پوش کے پاس پہنچ گیا۔ لڑکی باپ کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی گئی اور کچھ دوری پر رک گئی۔

"خاموش بڈھے...... ولیش دروہی" طاقت نے بوڑھی کمزور ٹانگوں پر تندرست لات ماری۔ بوڑھا لڑکھڑایا، گرا اور اس کا پاؤں پکڑ لیا۔

"خدا کے لیے...... میری......"

"چھوڑ حرام خور...... مفت کا کھا کھا کر طاقت آ گئی ہے۔ راشن پر سبسڈی ملتی ہے نا...... ہم کو ہی آنکھ دکھاتا ہے۔"

اس نے گرج کر کہا اور بندوق بوڑھے کی طرف تان دی مگر دور سے اس کو شاید اپنا افسر آتا دکھائی دیا تو اس نے بندوق نیچے کر کے اس کے دستے سے اس ضعیف کے کولہے پر زوردار وار کیا۔ وہ بلبلا کر گرا۔ وردی والے نے بندوق پھر اوپر کی تو بوڑھے کی بیٹی اپنے باپ پر گر گئی...... چیخ و پکار شروع ہو گئی۔

"معاف کر دیجیے سر جی...... آپ لے جائیے...... جو چاہیں" وہ رو پڑی......

"ہم چور ہیں...... کیا۔ کیا لے جائیں...... کیا چوری کیا ہم نے...... حرا......"

اس نے لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور پھر دھکا دیدیا۔ وہ دھڑام سے گری اس کا سر اوکھلی کے کونے سے ٹکرایا۔ چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا۔ اس کا نازک جسم ہچکیاں نگلنے کی کوشش میں جھیل کی طوفانی ہواؤں کی زد میں آئے شکارے کی طرح ہچکولے کھانے لگا۔

مجمع سن ہو گیا تھا۔ بچے کانپ رہے تھے۔ لڑکیاں اپنے رشتہ داروں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چیخوں کی جگہ ہچکیوں نے لے لی تھی۔

"یہ کیا...... یہ کیا ہو رہا ہے...... قیامت...... قیامتِ کبریٰ" ہلال احمد کا باپ چیخ پڑا...... دبی دبی سسکیوں میں اس کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔

ایک گولی زن سے اس کے پہلو کو چھیدتی ہوئی نکل گئی۔ وہ وہیں پر ڈھے گیا۔ ہلال احمد کی ماں ایک فلک شگاف چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

کہتے ہیں اس رات وردی والے آدھی رات کو پھر آئے تھے۔ جانے کس کی تلاش میں۔ انہیں وہاں کوئی نہیں ملا تھا۔ پھر بھی وہ کئی گھروں میں گھنٹوں رکے رہے۔ غلام حسن اس دن سے خون تھوکتا ہے۔ اور اس کی بیٹی اس رات سے بول نہیں سکتی۔ جب بھی نظر آتی ہے کسی کونے میں دبکی یا دیوار سے چپکی ہوئی۔ کسی کے بلانے پر اس طرح چونکتی ہے جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

ہلال احمد جب باپ کی آخری رسومات ادا کر کے آ رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں میدانِ حشر کی یاد تازہ تھی۔ وہ خلاء میں دیکھتا ہوا چل رہا تھا کہ کھیتوں کے آخری کنارے کے پاس آسمان سے بالکل قریب شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دھواں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ دور سے آتی ہوئی لوگوں کی آہ و بکا پر ذبح ہوتے ہوئے جانوروں کی سی غیر انسانی آوازوں کا گماں ہوتا تھا۔

گھر پہنچ کر ہلال احمد ماں کو تسلی کا ایک جملہ بھی نہ کہہ سکا۔ اس نے ماں کا سر اس زور سے چھاتی سے بھینچ رکھا تھا جیسے خود ماں اسے بچپن میں کسی بات سے خوف زدہ ہو جانے کے بعد' سینے سے لپٹائے رکھا کرتی تھی۔ وہ شاید آج بھی اس کے ممتا بھرے آنچل کی پناہوں میں کھو جانا چاہتا تھا جہاں اسے کوئی دلخراش منظر دکھائی نہ دے۔ مگر...... یکلخت وہ ماں کی باہوں کا حلقہ توڑ کر نکل آیا۔ کچھ قدم چل کر ٹھہر گیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر کچھ لمحوں کے لیے پتھر کے بت کی طرح جامد و ساکت آنکھیں پھیلائے ماں کو دیکھتا رہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ جانے اسے کدھر جانا تھا۔

جب وہ کھیتوں کے کنارے والے گاؤں سے گذرا تو اسے راکھ راکھ گھروں کے پاس ادھ جلی لاشیں نظر آئیں۔ کہیں سالم' کہیں آدھی۔ کہیں اعضاء۔ جیسے کسی بچّے نے کالی مٹی سے انسانی مورتیں بنانے کی کوشش کی ہو اور ناکام ہونے کی صورت میں انہیں آدھی ادھوری چھوڑ کر پھینک دیا ہو۔

ہلال احمد کو اب اور دیکھنا نہیں تھا۔

انجینیرنگ کالج باقی اداروں کی طرح ہفتے میں دو یا تین دفعہ کھلتا تھا۔

"رول نمبر ۲۲......" کوئی معلم پکارتا "ہلال احمد"......اپنے ہونہار طالب علم کو کلاس روم میں دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کرتا۔

"ایبسینٹ ہے سر" کوئی دوسرا طالب علم کھڑا ہو کر پوری کلاس کو دیکھ ڈالنے کے بعد اونچی آواز میں کہہ دیتا۔

"کیا بات ہوگئی اس کو......وہ بھی......اس کا مستقبل"...... معلم اپنے آپ سے جیسے بات کرتا۔ "کیا ہوگا اس کا۔ ایسے ذہین طلباء روز روز نہیں پیدا ہوتے......" معلم خود ہی خاموش ہو جاتا۔

ہلال احمد آر۔ای۔سی (Regional Engineering College) کا سالِ اول کا طالب علم رول نمبر ۲۲ بیچ ۱۹۹۱ غیر حاضر ہے۔ کیا وہ علم کا طلبگار نہیں رہا...... ہلال احمد کہاں ہے۔ گھر میں بھی نہیں ہے۔ اس کے کالج کے دوست اب اس علاقے کی طرف بہت کم آتے ہیں...... ہلال احمد کی ماں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سڑک پر نکل آتی ہے۔ جینس، ٹی شرٹ پہنے کسی لڑکے کو بغور دیکھتی ہے...... پھر...... ہلال احمد کے متعلق پوچھتی ہے۔ پھر مایوس ہو کر رو پڑتی ہے۔ کسی اور طرف چل دیتی ہے۔ اپنی طرح کی کئی عورتوں سے اس کی پہچان ہو گئی ہے۔ کسی کا لڑکا غائب ہے۔ کسی کا شوہر...... کسی کا بچہ دل کا مریض ہو گیا ہے۔ کسی کی بیٹی گونگی ہو گئی ہے۔ ہلال احمد بھی غائب ہے۔ پتہ نہیں اس کی ماں اسے کب دیکھے گی۔ دیکھے گی بھی یا......

اس کی ماں کو اب گھر میں کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ وہ اندر رہ کر کیا کرے۔ اس کے آنگن کے بائیں جانب اُگی پھولوں کی کیاریاں سوکھ گئی ہیں۔ داہنی طرف کا سبزیوں والا چھوٹا سا چمن اجڑا پڑا ہے۔ کناروں پر پیڑ اداس کھڑے ہیں اب وہاں بلبلیں گاتی ہیں نہ ابابیلیں آتی ہیں۔

ہلال احمد نے ایک سرد آہ کھینچی پھر اپنے زخمی لب کو چھوا۔ دیوار کی چوٹ سے اس میں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

"ہم پتھر ہیں تو تم لوگوں نے کون سی انسانیت کا ثبوت دیا ہے۔" کشن لال نے ڈیوٹی کی کرسی پر جھپکی لینے کا خیال چھوڑ دیا اور بدستور فرش پر اچھلتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تو تم لوگوں نے یہ دن دکھلایا ہے۔" ہلال احمد اداسی سے بولا۔ گذرے ہوئے

دنوں کے خیال نے اس کی آواز میں یاسیت شامل کر دی تھی۔

"پہل تو تم لوگوں نے ہی کی تھی۔ ہم تو فرض نبھا رہے ہیں"

"یہ ہے تمہارا فرض......؟" ہلال احمد نے اپنی داہنی طرف ُدس بارہ سالہ لڑکے کے بے جان جسم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کیا بگاڑا تھا اس معصوم نے اور یہ اپاہج نوجوان......اس کا تو ایک ہاتھ پولیو زدہ تھا......اس نے کیا کیا تھا۔ رپورٹ میں لکھ دو گے کہ مڈبھیڑ میں ہلاک ہو گیا۔ میں تو جانتا ہوں......میں اسے دھماکے کی جگہ سے کچھ پرے سے اٹھا لے جا رہا تھا۔ اس کا پاؤں بری طرح زخمی تھا۔ کہتا تھا کہ اس کی بیوی گولی کی آواز سے اس قدر دہشت زدہ ہے کہ کہیں دور سے بھی آواز آئے تو وہ گھنٹوں گھر میں بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اور پھر کئی دنوں تک اپنی آنکھیں مکمل طرح سے نہیں کھول پاتی۔ ایک چھوٹا سا بچہّ بھی ہے اس کا۔ اس کے ہاتھ میں دوائیاں تھیں بیوی کے لیے......جب......جب دھماکا میں نے کیا......ان بے گناہوں کو کیوں سزا دی......مجھے ہی سزا دیتے......تمہارے ساتھی کے ایک ہی تھپڑ سے اس بچےّ کی گردن ٹوٹ گئی......" ہلال احمد کی آنکھیں اس دوران بدستور نم تھیں۔ یہ جملہ کہتے ہوئے وہ اس قدر آبدیدہ ہو گیا کہ اس کی گلوگیر آواز اس کے حلق سے نکل نہ پائی۔

"اوپر سے حکم تھا......ہم کیا کرتے۔" کشن لال سلاخوں کے بالکل قریب کھڑے ہو کر آہستہ سے بولا۔

"یہ حکم تو نہ تھا......کہ جو بھی......جو ملے پکڑ کر بند کر دو......گولی مار دو۔"

ہلال احمد کی آواز میں بیزاری کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔

"سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لمبے ڈھیلے لباس پہنے۔ کون غلطی کر کے کدھر گھس جائے۔ کہاں ڈھونڈے آدمی ان کو......کبھی کبھی ایک گلی سے گذر کر وہ پاس کی ہی کسی دوسری گلی سے نکل جاتا ہے تب پکڑا جاتا ہے......اتنے راستے اور ہم انجان لوگ......کیا کر سکتے ہیں"۔

"اچھا طریقہ ہے۔ اگر وہ نہیں پکڑا جاتا تو اس جیسا کوئی جسے علم تک نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اسے پکڑ لیتے ہو۔ ورنہ اس جیسا نہ بھی ہو تو بھی کہاں بچ پاتا ہے......ایسے حساس علاقوں میں بغیر جانکاری کے جاتے ہو......اور......اور......" ہلال احمد ناہموار فرش پر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

"جب یہاں کی مقامی انتظامیہ کچھ نہ کر پائی......تو ہماری ڈیوٹی لگ گئی۔ ہماری کسی سے

کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں......"

کشن لال پھر ٹہلنے لگا۔ گو کہ بڑے بڑے دریچوں والی کشادہ، روشن راہداری میں اس کی آنکھوں کی سرخی سے اس کی تکان کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اصل میں دن کی تھی۔ شام کو جب ڈیوٹی بدلی تو اس نے اپنی جگہ آنے والے کو چابیاں تھمادی۔ وہ جانے والا تھا کہ باہر سے زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ اس کا چارج لینے والا بھاگتا ہوا آیا اور بولا کہ شاید اس گاڑی میں دھماکا ہوا ہے جس سے وہ آیا تھا۔ اور اس کا بھائی اسی گاڑی سے دوسری جگہ جو قریب ہی تھی جانے والا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ بلکہ باقی لوگ بھی باہر کر طرف بھاگے...... ایک وہ ہی وہاں رہ گیا...... اس کا ریلیور نہیں لوٹا۔ شاید اس کا بھائی زخمی یا...... جانے کیا ہوا کہ اور لوگ بھی ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ جب تک وہ اچھلتا کودتا رہا ٹھیک رہا۔ اب ٹہلتے ہوئے اسے پھر سردی نے اپنی جکڑ میں لے لیا۔ وہ کچھ آرام بھی کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے ایک کمبل پکڑا دو۔" کشن لال نے ایک بار پھر کہا۔

"تمہیں مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ کمرہ کھولو اور لے جاؤ۔" ہلال احمد نے دوسری طرف منہ کر کے کہا۔

"میرے پاس چابی بھی نہیں ہے اور دھماکے کی وجہ سے کئی لوگوں کی ایمرجنسی ڈیوٹی لگا دی گئی ہے۔ پتہ نہیں کون کہاں ہے۔ کب آئے۔ سٹور کیپر بھی نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں...... ورنہ اگر تمہارے پاس چابی ہوتی تو تم اندر آکر کمبل ہی نہیں بلکہ میری کھال تک اتار کر لے جاتے۔ تم لوگوں کو من مانی سے کون روک سکتا ہے۔"

"ضروری نہیں سب ایک سے ہوں...... اگر ایسا ہوتا تو میں تمہیں گولی مار دیتا۔ اور تالا توڑ کر کمبل لے لیتا...... جہاں دو پڑیں تھیں...... وہاں تین ہو جاتیں۔ کسی کے بھاگ جانے کا ڈر نہ رہتا...... مگر......" کشن لال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تو کر ڈالو اپنا ارمان پورا...... ویسے بھی ہماری کوئی سنے گا نہ تم سے کوئی باز پرس کرے گا...... تم ہی دیر لگا رہے ہو۔ تمہارا کوئی ساتھی ہوتا تو کب کا یہ سب کر چکا ہوتا۔" ہلال احمد اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تم لوگ خود کو ہمیشہ سے الگ کیوں سمجھتے رہے اور...... اب۔"

"ہم الگ سمجھتے رہے یا تم لوگوں نے ہمیں اکیلا چھوڑ رکھا ہے۔ پچاس سال ہو گئے ملک

کو آزاد ہوئے...... ایک پل تھا جو جوڑ سکتا تھا ہم لوگوں کو تم سے...... ایک...... ایک مثال دیتا ہوں...... تعمیر ہوا کیا...... ہوا...... بتاؤ۔"

"ہے تو راستہ...... ہوائی بھی ہے۔"

"اوسط طبقے کے انسان کو کیا یہ لوازمات میسر ہیں؟...... اور سڑک کا حال کیا تم نہیں جانتے۔ تم بھی تو وہیں سے آئے ہو۔" ہلال احمد کے چہرے پر سوالیہ تاثرات میں بے چارگی شامل تھی۔

"کہتے ہیں اس کے لیے بے شمار اثاثہ چاہیے...... پل...... تو میرے گاؤں کا بھی ہر برسات میں بہہ جاتا ہے...... اور پھر لوگ کیسے......" کشن لال نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بے شمار اثاثہ...... مہاتما گاندھی پل بھی تو بہت طویل ہے...... بنایا گیا نا...... ہمیں نہیں چاہیے کیا راستہ...... سڑکیں...... ریلوے لائن...... یہاں کے اکثر لوگوں نے...... جانتے ہو ریل کی شکل صرف فلموں میں دیکھی ہے......"

"اس پار ہے تو سہی ریل...... سارے علاقے میں......"

"اس پار...... اس پار کیا تمام دوسرے پہاڑی علاقوں میں ہر ایک سہولت ہے...... لیکن...... تنگ نظر لوگ...... مذہب کی بنیاد پر یہ سوتیلا سلوک کرتے ہیں۔"

"یہ بات تم جتنی آسان سمجھتے ہو...... اتنی ہی مشکل ہے...... کچھ جغرافیائی' کچھ معدنیاتی نکتے ہیں۔ یہ کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے......"

"کیوں کیا تمہیں جدید ٹیکنالوجی میسر نہیں۔ کسی کے دل میں ہمارے لیے درد تو ہو۔ خیر یہ تو میں ایک مثال دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ بات آسان نہ ہو مگر اور بھی ایسی کئی باتیں ہیں۔ اصل میں سب کو جھیلیں اور پہاڑ چاہئیں۔ بھلے ہی زمین خون سے سرخ ہو جائے' اس پر اُدھر والے بھی اپنا آسمان چاہتے ہیں۔ اِدھر والے بھی۔"

"یہ بات تم اپنے لیڈروں سے کیوں نہیں کہتے۔" کشن لال کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"رہبر ہوتا تو ہم اس طرح کیوں بھٹکتے۔ جن پر تکیہ تھا' اعتماد شکن ہوئے۔ اپنی پیڑیاں محفوظ کرنے کی فکر میں رہے۔ ورنہ ہماری نسل کے لوگوں میں ادھر والوں کے لیے کوئی ایسا نرم گوشہ تھا نہ خواہش تعلق۔ ہم تو نارمل جینا چاہتے تھے مگر۔"

"لیڈر ہمارے بھی ایسے ہی ہیں...... اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں" کشن لال نے آہستہ سے کہا۔

"اگر پہلے پہل تم لوگوں کی طرف سے کوئی مخلصانہ برتاؤ حاصل ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ چن چن کر قصوروار ہی پکڑے جاتے تو عام لوگوں کا ساتھ بھی میسر ہوتا کہ خود ہر امن پسند انسان ان حالات سے پریشان تھا...... ہم تو دونوں طرف سے پس گئے۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن...... بہت سوں نے محض اپنی حفاظت کے لیے غلط راستہ چنا۔ اور بہتوں کو تو یہ تک یقین ہو گیا کہ دراصل جو گمراہ ہوئے تھے وہی صحیح تھے۔ اور جو متاثر ہوئے وہ...... وہ والدین...... ماں باپ...... کیریر...... ماں...... اپنی ماں چھوڑ کر......" ہلال احمد کی آواز بھرا گئی۔ اس نے سلاخوں کو زور سے بھینچ کر ان پر سر ٹکا دیا۔

"مگر پھر بھی یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا......" کشن لال نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ اس لیے...... کہ تم لوگ ان کے ہتھیار پکڑ کر ان ہی کو بیچ دیتے ہو۔ جو نہ خرید سکے وہ مارا جاتا ہے...... ورنہ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

"تم کیسے جانتے ہو یہ سب...... میں نے بھی کچھ ایسا سنا تھا کہ کہیں کہیں شاید......"

ہر وہ شخص جانتا ہے جو خود کو تم لوگوں سے واپس خریدنے کی طاقت نہ رکھتا ہو' ہلال احمد نے منہ دوسری طرف موڑ کر کہا۔

"تمہارے شناختی کارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ پڑھے لکھے ہو۔" کشن لال اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تم بھی تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو۔" ہلال احمد لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد کچھ دھیمی آواز میں بولا

"ہاں۔ بی۔ ایس۔ سی۔"

"سائنس گریجویٹ؟ اور یہ نوکری" ہلال احمد حیرت سے بولا۔

"یہ بھی ساری حیثیت داؤ پر لگا کر حاصل ہوئی۔"

"یعنی مال کے بدلے جان کا خطرہ مول لیا۔"

"ہاں...... ایسا بھی سمجھا جا سکتا ہے۔"

"کیا یہ باتیں اوپر نہیں پہنچتیں؟" ہلال احمد نے نرمی سے پوچھا۔

"نہیں...... بلکہ آتی ہی اوپر سے ہیں...... ایک ایک زینہ طے کرتی ہوئیں۔" کشن لال

نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ہلال احمد کے زخمی لبوں پر ایک مجروح سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کمرے کی دیوار تک جانے لگا تو اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا......

نہ لاشیں...... نہ کمبل......

مگر کچھ قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی نظروں کو تاریکی میں دیکھنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ جب وہ کمبل اٹھا کر سلاخوں کے پاس لایا تو کشن لال سگریٹ کے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال رہا تھا۔

''کہتے ہیں کہ اب حالات بہتر ہو رہے ہیں...... تم سگریٹ پیتے ہو......؟''

''ہاں...... کبھی کبھی پی لیتا ہوں...... شاید ہو جائیں' یہ تو اوپر والا ہی جان سکتا ہے۔''

☐☐

(''نیا سفر'' الٰہ آباد، ۲۰۰۰ء)

ایجاد کی ماں

میرو مامی نے جب دہلیز کی طرف نظر اُٹھائی تو ٹھٹھک گئی۔ دو قدم آگے بڑھی اور حیرت سے کھلے منہ پر انگلیاں دھرے، ماتھے پر دو ایک سیدھے بل اتنی شدت سے کھینچے کہ ابرو آپس میں ملے ہوئے نظر آنے لگے۔

"کیا ہوا تجھے دے جوانی مرگا۔" میرو مامی حیرت اور غصے سے بولی اور سلیم کا ماتھا شہادت کی اُنگلی سے دبا کر اوپر کیا۔ سلیم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ممانی کی طرف دیکھا۔ اور لگاتار ادھر ہی دیکھتے ہوئے کمرے میں داخل ہو کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور ممانی کو گھورتا رہا۔ وہ اس کے ساتھ دیوار تک آئی اور اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا اوے۔ ڈنگر کدھر ہیں۔؟" میرو مامی نے اپنی بڑی سی اوڑھنی سے ناک پونچھی اور اوڑھنی کو شانے سے پیچھے کی طرف پھینک کر کہا۔ اس کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی چونکہ دروازہ اس کوٹھری نما گھر میں روشنی کا واحد بڑا ذریعہ تھا، اس لیے اس کی زرد چھینٹ کی اوڑھنی سے چھن کر آنے والی روشنی نے کمرے کی فضا کو پیلا کر دیا تھا اور چھت پر بنے چولھے کا دھواں نکلنے والے چھوٹے سے سوراخ سے سورج کی کرنیں سیدھی سلیم کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے میرو مامی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

سلیم کی عمر کوئی پندرہ برس ہو گی۔ دُبلا بدن، بھولا چہرہ، ماتھے پر خم دار بالوں کے گچھے۔ اس کی ماں بچپن ہی میں انتقال کر گئی تھی۔ باپ تمباکو کا عادی تھا، کھانستے کھانستے اللہ کو پیارا ہو گیا تو ماموں سلیم کو گھر لے آئے۔

ماموں کھیتوں پر ہوتے تو میرو مامی گھر میں اپنی چھوٹی سی بٹیا کے ساتھ اکیلی ہوتی۔ گھر کے کتنے ہی کام تھے ..... جیسے گھر کے ساتھ لگی باڑی سے ترکاری لے آنا، مرغیوں کو ڈربے

سے نکالنا، بند کرنا، بھیڑوں کو چرانے لے جانا۔ قریب کی ندی میں سے پانی بھر کے لانا۔ اب کم از کم سلیم ہی گھر میں ہوگا تو ماموں کی فکر کم ہو جائے گی۔

ویسے میرو مامی سلیم کو دیکھ کر کچھ خوش نظر نہیں آرہی تھیں۔ کسی زمانے میں میرو مامی کا نام مہر النساء تھا۔ وقت نے توڑ مروڑ کے پہلے میرو پھر مامی کر دیا۔

کچھ دنوں میں جب میرو مامی جان گئی کہ سلیم اس کا آدھے سے زیادہ کام بہت کم وقت میں نپٹا لیتا ہے تو وہ اسے برداشت کرنے لگی۔ مگر اسے اس کے کام پر غصہ آتا رہتا اور وہ سلیم کو اکثر مارتی پیٹتی۔ پہلے پہل وہ مار کھاتا اور روتا۔ کچھ عرصے بعد اس نے رونا چھوڑ دیا، چپ چاپ پٹتا، مگر اب کچھ مہینہ بھر پہلے سے جب ممانی لکڑی اٹھاتی تو سلیم ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا غائب ہو جاتا۔ کبھی ہنستا ہوا کوٹھری کے آس پاس چکر لگاتا اور کبھی قریب کے اخروٹ کے درخت پر چڑھ بیٹھتا۔ بلکہ کبھی کبھی ننھی سی مریم کو بھی اوپر کھینچ لاتا۔ ممانی کھولتی رہتی۔ برا بھلا کہتی، کوستی۔ پھر جب ماموں آجاتے یا کافی دیر ہو جانے پر ممانی کا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہوا محسوس ہوتا تو سلیم، مریم کو کندھے پر بٹھائے، توبہ توبہ کہتا ہوا ٹہنیوں سے اتر آتا۔

"اب نہیں کروں گا میرو مامی۔ کروں تو میری یہ ٹانگ توڑ دینا اللہ قسم۔ اب نہ کروں گا۔" وہ کان پکڑ کر ٹانگ آگے کر دیتا۔ اور ممانی لکڑی پھینک کر بدلے میں ایک آدھ ہتھڑ جما کر کام بتا دیتی۔

مریم اور ماموں دونوں سلیم سے پیار کرتے تھے۔ بس ایک ممانی...... مگر جب ماموں گھر میں ہوتے تو ممانی اسے مارتی نہیں تھی۔ کوستی بھی نہیں تھی۔ کھانا کھلاتے وقت اسے اپنے قریب ہی چولھے کے پاس بٹھاتی۔ وہ توے سے موٹی موٹی روٹیاں پکا کر چولھے کے سامنے دہکتے انگاروں کے بالکل قریب رکھ دیتی اور سلیم روٹیوں کو سینک سینک کر ماموں اور مریم کو پکڑاتا۔ مکئی کی موٹی موٹی سوندھی سوندھی روٹیاں۔ کڑم کے ساگ کے اچار یا پھر باڑی میں اگائی گئی کسی ترکاری جیسے آلو، کدو وغیرہ کے ساتھ۔ یا پھر کبھی کبھی ڈربے کا کوئی بیمار مرغ پکا کرتا اور اس میں سے سلیم کو گردن کا ایک ٹکڑا یا پسلیوں کا پنجر ملتا۔

کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ ماموں کو سب کچھ بتا دے۔ مگر پھر خود ہی ارادہ بدل دیتا۔ ماموں کیا سوچیں گے۔ سمجھیں گے کہ میں پیٹو ہوں۔ پھر کچھ سوچنے لگ جاتا۔ کبھی مریم ماں کی نظر بچا کر اپنی رکابی میں سے اس کے کھانے میں چپکے سے ایک بوٹی اچھال دیتی۔ اور وہ

اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے آنکھیں میچ کر اور سر ہلا کر اس کا شکریہ ادا کرتا۔ مگر پھر بوٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہڈی پر سے اتار کر واپس اس کی تھالی میں ڈال دیتا اور خود ہڈی چوس کر خوش ہو جاتا۔

ماموں کا گھر پہاڑیوں کی دامن میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے آخری سرے پر تھا' جہاں تھوڑی دور پر چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پتھروں سے بھری پتلی سی ندی شور مچاتی ہوئی بہا کرتی اور اس کے بعد باغوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ جو جگہیں درختوں کے درمیان خالی تھیں وہاں مکئی بوئی گئی تھی۔ باغوں کی آخری حد کے ساتھ چراگاہیں تھیں جنگل سے لگی ہوئی۔ سلیم صبح ہی صبح بھیڑوں کو چرانے لے آتا اور سہ پہر ہوتے ہوتے لوٹ آتا۔

اس دن اس نے میمنے کو گردن کے اوپر گلوبند کی طرح ڈال دیا تھا کہ وہ دو ٹانگیں اس کے دونوں شانوں سے آکر اس کے سینے پر گرتی تھیں' اور ایک ہاتھ سے بھیڑ کی رسی تھامے اور ایک ہاتھ پھیلا کر ندی کے پتھروں پر توازن برقرار رکھتا ہوا ندی پار کر رہا تھا کہ اسے ندی کے مشرقی سرے کی جانب ابراہیم چچا کی پن چکی پر معمول سے کچھ زیادہ لوگ نظر آئے۔

''ابراہیم چاچا ٹھیک تو ہیں۔ اتنے لوگ؟'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور چکی کی طرف دوڑا۔

وہاں عجیب منظر تھا۔ ابراہیم کی تیسری بیوی صاجی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ سارے بال کھلے تھے اور شانوں اور چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ زور زور سے سر ہلا ہلا کر ایک ردھم سے سانس لیتی ہوئی جانے کیا کہہ رہی تھی۔ ابراہیم چچا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ لاولد تھے۔ پہلی دونوں بیویوں کے انتقال کے کوئی سات برس بعد بیوا صاجی سے کوئی چھ ماہ پہلے ان کا نکاح ہوا تھا۔

ابراہیم چچا صاجی کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ پتہ نہیں یہ خیال انہیں کیوں آتا تھا۔ ورنہ صاجی نے تو آتے ہی سارا گھر سنبھال لیا تھا۔ گھر اس کا بھی ویسا ہی تھا جیسے اس طرح کے پہاڑی دیہاتوں میں ہوا کرتے تھے۔ چھوٹے بڑے پتھروں اور گارے سے بنے ایک کمرے پر مشتمل۔ مگر صاجی نے گھر کے گرد کیکر کی کانٹے دار ٹہنیوں سے جنگلا بندی کر رکھی تھی۔ اور وہاں خوب ترکاریاں اگائی تھیں۔ وہ اپنی گرہستی میں خاصی مسرور اور مصروف تھی۔ پھر آج کیا ہو گیا تھا۔

''ابراہیم چاچا' کے ہویا''۔ (کیا ہوا) سلیم نے قریب آکر پوچھا۔ ''پتہ نہیں پترا۔ تیری چاچی سویرے بھلی چنگی تھی۔ دوپہر روٹی کھانے گھر گیا کہنے لگی ڈنگر بازی کا ایک کونا

چر گئے۔ چٹنی واسطے پودینہ چنتی رو پڑی۔ پھر اچانک میرا ہاتھ پکڑ کے ادھر جندرتے آ گئی۔ خبر نہیں کیا کہتی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ بس تڑپدی ہے۔ رب خیر کرے۔" ابراہیم چچا نے پریشان ہو کر کہا اور جلدی جلدی صاجی کو پنکھی جھلنے لگے۔

ذرا میں بھی سناں۔" سلیم صاجی کے قریب گیا تو جو لوگ اب تک دور دور کھڑے تھے وہ بھی پاس آ گئے۔

میں تے ڈورا (بہرا) ہو گیا۔ کچھ سنتا ہی نہیں۔" ابراہیم چچا بھیڑ سے بولے۔

ایک ایک ختم ہو جائے گا۔ کسے نوں نئیں چھوڑنا۔" صاجی اپنے جسم کو سانسوں کے زور پر جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔

"سارا گراں ختم ہو جائے گا۔" صاجی بولتی گئی۔ ابراہیم چچا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"خیر کر یا رب۔ خیر کر۔ ارے اوئے کوئی جاؤ پیر صاحب کو بلاؤ۔ جلدی۔ جلدی جاؤ وے۔ چھوڑ۔ چھوڑ میری صاجی کو۔ چھوڑ دے۔" ابراہیم چچا گڑ گڑائے۔

ہرگز نہیں آج اس کی باری ہے، کل۔" صاجی کی آواز اچانک مردانہ ہو گئی۔ سب لوگوں پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ سلیم بھی کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا مگر سارا منظر نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان باتوں کے بارے میں پہلے کہیں سنا تو تھا مگر دیکھنے کا اتفاق آج ہوا تھا۔

پیر صاحب دھان کے گھاس کی گندھی رسی کی بنی جوتیاں اور اخروٹ کی کچی چھال سے رنگی زرد لوئی اوڑھے تیز تیز قدم اٹھاتے کھانستے کھنکھارتے دائیں بائیں گردن موڑتے اور کبھی دور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے زور زور سے بازو ہلاتے ہوئے آگے بڑھے۔ مجمع ہلا ڈلا اور قوس کی شکل میں کھڑا رہا۔

"کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟" پیر صاحب قریب پہنچ کر زمین پر بیٹھ گئے اور گرج کر بولے۔

"حبیب لون ہوں۔ ٹھیکری سے آیا ہوں۔" صاجی کی مردانہ آواز بھی گرج کر بولی۔

مجمع میں بھنبھناہٹ سی ہوئی۔ جبار لون گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"بڑے بابا۔ میرے بڑے بابا۔ میں نے کیا کیا؟"

"کیا ہوا جبار چاچا۔ ؟ بڑے بابا کون۔ کون ہیں؟" سلیم نے جلدی سے پوچھا۔

"بڑے بابا۔ وہ۔ وہ چھوٹی پہاڑی پر۔ مقبرہ ہے ان کا۔ جسے ٹھیکری کہتے ہیں۔ وہ جو لال بھربھری چٹان سے بنی ہے۔ جبار چچا کے دادا ہیں۔" کسی نے جواب دیا۔

"کیا چاہتا ہے۔؟ بول!" پیر صاحب دہاڑے۔

خاموشی۔ سانسوں کا اتار چڑھاؤ۔

"بول کیا چاہتا ہے۔ ورنہ۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

پیر صاحب نے صاجی کے شانے جھنجھوڑے۔

"صدیاں ہو گئیں۔ میرے نام پر۔ کوئی بھیڑ نہ بکرا۔ میرے پوتے پڑپوتے بھول گئے مجھے۔ اب نہیں بچے گا کوئی۔ ورنہ حاضر کرو۔ حاضر کرو۔ اندھے کو بکرا چاہئے۔ بکرا چاہئے اندھے کو"۔ صاجی کی مردانہ آواز چڑھتی سانسوں میں بولی۔

"اس خاتون نے کیا بگاڑا ہے"۔؟ پیر صاحب نے صاجی کے شانے پر ہتھڑ جما کر کہا۔

"اوئی......" ہاتھ کی چوٹ پڑنے سے مردانہ آواز یکلخت زنانہ آواز میں چیخی اور پھر واپس مردانہ آواز میں بولنے لگی۔

اسی نے تو کیا ہے اُسے بہانا تھا۔ بس وہی دے دو۔ ادھر ندی کے کنارے۔ سب کو کھلاؤ۔ ادھر چکی کے پاس۔ جبّارے کا کالا بکرا۔ ابھی اسی دم۔ ورنہ۔ ورنہ"۔ مردانہ آواز نے حلق سے بادلوں کی سی گڑگڑاہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

جبّار لون کپکپا رہا تھا۔

"پھر چھوڑ دو گے؟"

"ہاں۔"

"دوبارہ تو نہیں لوٹو گے؟"

"نہیں۔"

"گاؤں کے کسی بھی گھر میں؟"

"نہیں۔ مگر۔ بکرا۔ ورنہ کوئی ڈنگر۔ نہ بچے گا۔ سب کے پاس آؤں گا۔ ہر گھر میں گھسوں گا۔ یاد رکھنا۔"

"نہیں۔ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔ اب جاؤ۔ جاؤ۔" پیر صاحب نے رعب دار آواز میں تحکمانہ کہا۔

صاجی زور سے کانپی۔ تھرتھرائی اور دھم سے چکی کی دیوار سے لگ گئی۔ پیر صاحب نے پانی منگوایا۔ مٹی کی کوری سکوری میں ندی کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی لایا گیا۔

ابراہیم چچا نے صاجی کے چہرے سے بال ہٹائے اور اپنی پگڑی کے شملے سے اس کے

ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔

پیر صاحب نے پانی چھڑکا۔ صاجی نے آنکھیں کھولیں۔

"مجھے کی ہویا۔" وہ رُک رُک کر بولی۔

"کچھ نہیں۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔" ابراہیم چاچا نے اسے سہارا دے کر پانی پلایا۔ کچھ مکئی اور کچھ روپے پیر صاحب کی نذر کیے۔

لوگ جبار لون سے باتیں کر رہے تھے۔

اس دن سلیم نے بھیڑوں کو چراگاہ کے پاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود ٹھیکری کے گرد گھومتا رہا۔ دوپہر کو واپس چل دیا۔ جب اس نے ندی پار کی تو کالے بکرے کی لمبی کھال بڑے سے تختے پر کیلوں کے سہارے سولی کی طرح گڑی ہوئی سوکھ رہی تھی۔ کتنا اونچا لمبا تھا کالا بکرا۔ صاجی چاچی کی باڑی کے گرد لگے کیکر کے جنگلے سے کئی فٹ اوپر گردن کر کے ترکاری چر جاتا تھا اور اسے کانٹا چبھنا تو دور، کانٹا چھوتا تک نہ تھا۔

سلیم کو دیدے پھاڑے دیکھ کر میرو مامی گھبرا گئی تھی۔ ذرا نرمی سے بولی۔

"کیا بات ہے سلّو بیٹے۔؟" پہلی بار سلیم کو اس نام سے مخاطب کیا تھا مامی نے۔ یہ سنتے ہی سلیم دھپ سے نیچے بیٹھ گیا اور زور زور سے سر جھٹک جھٹک کر جسم ہلانے لگا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور گال ہل رہے تھے۔

"مریاں"- میرو مامی چلاّئی- مریم بھاگی آئی۔

"کیا ہوا اماں۔"

"دوڑ۔ بابا کو بلا کر لا- سلیم کو-ہائے ربا رحم کر۔"

میرو مامی کانپ رہی تھی۔ وہ اس جگہ سے اٹھنے لگی تو سلیم کی زنانہ آواز گونجی۔

"کدھر جاتی ہے۔ بیٹھ۔ سن۔ آج تجھے سب سننا پڑیگا۔ نند ہوں۔ میں تیری نند۔ میرا بیٹا تمہارا بیٹا نئیں کیا۔؟"

"ہے۔ ہے آپاں۔ کیوں نئیں۔"

"تے فیر۔"

"معاف کر دیو آپاں جی"۔

"معاف ؟۔ ہوں !۔ نیاز دے گی اندھی کو؟"

"ضرور۔ آپاں جی۔ ضرور، ضرور۔ آپاں جی۔"

"اندھی کگڑ (مرغا) کھائے گی۔ سارے کا سارا۔ وہ سب سے بڑا۔ لال پیلے پروں والا۔ سمجھیں۔"

"وہ نکا (چھوٹا)۔ کالے رنگ دا نئیں؟۔ آہاں جی۔ وہ اصلی دیسی ہے"۔

"نئیں۔ خبر دار۔ وڈا (بڑا)۔ لال، پیلا، نیلا کگڑ ورنہ۔ کل مریاں۔ مریاں دی باری۔ پھر تیری۔ پھر......"

"نئیں آہاں جی۔ لال مرغا"۔

"سارے کا سارا۔ اچھی طراں پکا کے"

"ہاں جی...... آہاں جی۔"

"جا پکڑ کے لا۔ نئیں ٹھہر جا۔ میرے پاس رہ"۔

آواز گرجتی رہی۔ ممانی کانپتی رہی۔ ماموں بھاگے آئے۔

سلیم کے بال سہلائے۔ مریم باپ کے ساتھ لگی سلیم کو دیکھنے لگی۔ جو بدستور زور زور سے سانس لیتا چھوڑتا ہوا اپنا جسم تیز تیز ہلا رہا تھا۔

میر و مامی نے ساری بات بتائی۔

وضو کرو جی۔ میں بانگی پکڑتی ہوں۔ مریاں دی سوں (مریم کی قسم) جی ذرا جلدی کرو۔"

ممانی سلیم کو دیکھتی ہوئی باہر کو لپکی۔

کچھ ہی دیر بعد مرغے کی فریاد بھری 'کیں کیں' سنائی دی۔ ماموں چولھے کے پاس سے پانی کی کٹوری لے آئے اور سلیم کے پاس رکھتے ہوئے مونچھوں میں چھپی مسکراہٹ کو ذرا سا نمایاں کر کے بولے۔

"لے پانی پی۔ جھٹکے کھا کھا کر پسینہ پسینہ ہو رہا ہے"۔

اس نے پکڑ لیا ہے مُرغا۔ میں حلال کر کے آتا ہوں"۔

مریم دونوں کو دیکھنے لگی سلیم نے آنکھیں کھولیں۔ ماموں کو دیکھا۔ ہنسی دانتوں میں دبا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"آ جلدی کر۔ اس کے منہ پر چھینٹے مار"۔ ممانی اندر آئی تو ماموں نے اس کے ہاتھ سے مرغ لے لیا اور پانی کی کٹوری تھمادی۔

☐☐

("نیا دور" لکھنؤ، ۱۹۹۹ء ــــ "تسطیر" لاہور، ۲۰۰۰ء)

پوتھی پڑھی پڑھی

بالکنی میں کھڑے ہونے کے بعد جب میں نے اوپر نظر اٹھائی تو راکھ کے رنگ کے آسمان کو دیکھتے ہی طبیعت بجھ سی گئی۔ اُداسیاں پھن پھیلائے میرے دائیں بائیں آکھڑی ہوئیں۔ مجھے خود کو ان ناگنوں کا شکار نہیں ہونے دینا چاہیے۔ زندگی ٹھہر تو نہیں گئی۔ کہ...... کہ...... ایسا نہیں ہے کہ راکھ کے رنگ کا آسمان دیکھنے کی میں عادی نہیں ہوں، مجھے تو عادت ہی ایسے آسمان تلے جینے کی ہے۔ دہائی بھر سے اوپر ہو گیا اب تو۔ بس کبھی کبھی کچھ دنوں کی چھٹیاں منانے کا موقع مل جائے یا کسی کانفرنس یا سیمنار میں کہیں شہر سے باہر جانا ہو تو بات دوسری ہے۔ جب آسمان کا اصلی رنگ نظر آتا ہے۔ نیلا، فیروزی یا کپاس کے پھولوں ایسا سپید۔ یا کالے گھنے گھنے بادلوں سے ڈھکا ہوا، جھانکتا، چھپتا۔

ایسا ہی ایک اسٹڈی ویک اٹینڈ کر کے لوٹی تھی میں صبح ایک پہاڑی مقام سے۔ بلکہ ایک حسین ترین پہاڑی علاقے سے۔ کوئی چھ دن کے بعد۔

رات ٹرین کے آرام دہ کمپارٹمنٹ میں سوئی رہی۔ مگر شاید تین یا ساڑھے تین گھنٹے۔ حالانکہ میرے پاس سونے کے لیے پورے سات گھنٹے تھے۔ مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ مجھے پہاڑ پر گزری ہوئی شاموں کا خیال آرہا تھا۔ یہاں ایسی یکسوئی سے شام گزارنا ممکن ہوتا تو یہ اُداسیاں میرے ارد گرد...... اس طرح......

جب میں پہاڑ پر پہنچی تو صبحِ کاذب کے چہرے سے سیاہ نقاب سرکنے والی تھی، ہوا میں خنکی تھی۔ اور خنکی میں رچی نمی نے یہ احساس دلایا کہ صبح پاس ہی کہیں منتظر ہے۔ اس بار میرے ساتھ کئی چیزیں پہلی بار ہوئی تھیں۔ میری نیند گہری نہیں ہوتی مگر چونکہ پہلی بار شب کا سفر کیا تھا اس لیے گھڑی اتار دی تھی کہ شاید تکان کا مارے نیند گہری آئے اور کوئی

چور دور......

میں نے سفری بیگ کی زِپ سے لگا ننھا سا تالا کھول کر گھڑی نکالی تو چار بجنے میں ۱۰ منٹ باقی تھے۔ یہ بھی پہلا موقع تھا کہ میں سحر کے وقت کسی پہاڑی مقام پر کمرے سے باہر تھی۔ یہ سفر بھی میرا پہلا تنہا سفر تھا۔ پہلی بار میں نے سحر کی بھیگی ہواؤں کی خوشبو محسوس کی تھی۔ نیند کی کمی سے بوجھل سلگتی آنکھوں میں ایسی ٹھنڈک پڑی جیسے یعقوبؑ کو یوسفؑ کا لباس چھو جانے سے۔ تھکن سے چور بدن میں تازگی کی لہر دوڑ گئی، جیسے آٹھ نو گھنٹے آرام کیا ہو۔ جی چاہا کہ سامان گیسٹ ہاؤس کے چوکیدار کے حوالے کر دوں اور خود وہیں اس مختصر سے زینے کے کنارے پر بیٹھ کر شبنم میں بھیگ جاؤں، تو یہ ہوتا ہے سَحر کا سِحر۔ نئی زندگی جیسا، نئی روح ایسا۔

میں لمبے سانس لیتی ہوئی آسمان پر چمکتے ستاروں کو تکنے لگی۔ چوکیدار نے مجھے دیکھا تو خود ہی سامان اٹھا کر اندر کی طرف چل پڑا۔ اس کا اوجھل ہونا تھا کہ میں نے اپنے نرم گرم شال کو دُپٹے کی طرح گردن سے لگا کر شانوں کے پیچھے پھینکا اور باہیں آسمان کی طرف پھیلا کر ایک پاؤں پر ایک دائرہ ناچ لی، جیسے کہ آسمان سے ستارے ٹوٹ کر میرے ہاتھوں میں آنا چاہتے ہوں۔ ہوا سرد مگر فرحت بخش تھی۔ میرے ہونٹوں پر جانے کب سے ہلکی ہلکی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے اندر مجھے ایک غیر یقینی سی خوشی اور توانائی کا احساس ہوا تو مجھے خیال آیا کہ داناؤں نے اسی لیے نسیم سحر کی اس درجہ پذیرائی کی ہے۔ اور اس مقام کی سحر...... بات دو آتشہ ہو گئی۔ اگر صبح اتنی دلربا ہے تو شام کیسی جادو بھری ہو گی۔ جب طیور اپنے اپنے آشیانوں کی طرف پرواز کرتے ہوئے آپس میں چہلیں کرتے ہوں گے۔ میں کمرے کی بالکنی میں کرسی پر بیٹھ کر کافی کا گرم گرم مگ ہاتھوں میں تھامے انھیں دیکھوں گی اور ساتھ ساتھ حنا سے باتیں بھی۔

اوہ! میں تو بھول ہی گئی۔ اس بار ایک اور نئی بات بھی ہوئی تھی۔ حنا میرے ساتھ نہیں تھی۔ اس کے بغیر میں زندگی بھر کبھی کہیں نہیں گئی۔ کبھی کبھی اپنی پرانی تصویریں دیکھا کرتی ہوں۔ چاند سے چہرے والی حنا کی گود میں ننھی سی، گل گوتھنا سی میں۔ رنگ برنگے پھولوں والا فراک پہنے ہوئے۔ دونوں ٹخنوں میں چھم چھم کرتی ہوئی، بے شمار گھنگھروؤں والی پازیبیں پہنے۔ یہ پازیبیں میں نے حنا کے جنم دن پر پہنائی تھیں اسے۔ ہاں یاد آیا۔ تصویر میں

چاند سے چہرے والی وہ لڑکی حنا نہیں، میں ہوں اور میرے گود میں حنا پائلیں پہنے ہوئے۔ حنا نے بولنا بہت جلد سیکھ لیا تھا۔ اور چلنا بہت دیر سے۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ بہت ذہین ہوتے ہیں جلد بولنے والے بچے۔ اور چلی تو وہ سال بھر سے کچھ اوپر ہو گئی جب ہی۔ پازیبیں پہنے ہوئے جب وہ گول نرم پاؤں اٹھا کر تھپ تھپ کرتی ہوئی چلتی تو فضا میں ایک لطیف سا ترنم چھڑ جاتا۔ گھنگھریاں چھن چھن بجتیں اور دھپ کی آواز کے ساتھ ایک دم بند ہو جاتیں۔ اور میں کان کلکاریوں پر لگا دیتی۔ بھاگ کر اسے گود میں اٹھا لیتی۔ وہ ایک آنکھ پر ہاتھ رکھے دوسری آنکھ سے میری راہ دیکھتی ہوئی ناز بھری آواز میں پکار چھیڑ دیتی۔

"ماریں گے۔ ماریں گے اس فرش کو ہم۔ ہمارے بچے کو چوٹ لگا دی۔ ؟ گرا دیا۔ ؟ بہت خراب بات ہے۔ بہت خراب"۔ میں ایک پاؤں دو چار بار فرش پر پٹختی اور اس کی ایک آنکھ کے پاس بسیار محنت کے باوجود بھی نہ آیا ہوا آنسو جھوٹ موٹ پونچھ کر سینے سے لپٹائے اپنے پاس لے آتی۔ وہ اپنی ننی منی باہیں میرے گلے سے لپٹائے رکھتی۔ میں لکھنے کی میز کے پاس آتی تو وہ میرے زانوں پر بیٹھی رہتی۔ میز کو زور زور سے تھپکتی، پھر پتہ نہیں کب گود سے اتر جاتی۔ وہ جب چاہے گود سے نکل جاتی تھی۔ چاہے میں کسی بھی زاویے سے اسے لیے رہوں۔ پکڑ کر کچھ کھلاؤں، دبوچے رکھوں مگر جانے کس طرح وہ بغیر روئے، شور مچائے، ہنستی ہوئی، مچھلی کی طرح...... نہیں...... مکھن کی ڈلی کی طرح ہاتھوں سے پھسل جاتی۔

وہ کبھی روتی نہیں تھی۔ میں گھنٹوں اسے اپنے ساتھ کبھی کہیں، کبھی کہیں بٹھائے رکھتی۔ ہال میں یوں بیٹھتی جیسے میں نہیں وہی ان کانفرنسوں اور سیمناروں میں شریک ہونے آئی ہو۔ خاموش دیکھتی، سنتی ہوئی۔ میری مختصر سی دنیا کی تکمیل میں اس کے مزاج کا بھی ہاتھ تھا ورنہ عنظر سے علیحدگی کے بعد شاید میں بھی کچھ سوچتی۔ مگر میری اس دوست اور رفیق نے مجھے کبھی احساسِ تنہائی نہ ہونے دیا۔ ہر حال میں میں نے اسے صبر و شکر کی تصویر پایا۔ میں اگر مصروف ہوں اور اس کے دودھ کا وقت ٹل رہا ہے تو وہ چپ چاپ شہادت کی انگلی منہ میں ڈالے ساکت لیٹی چھت کو تکا کرتی۔ میں آتی تو مسکرا دیتی۔

وقت کو ایک کام بہت اچھی طرح آتا ہے۔ پر لگا کر اڑنا۔ وقت میرے دیکھتے دیکھتے اڑ گیا۔

حنا کے ہاتھوں میں مہندی رچی۔ وہ چلی گئی۔ میری حنا مکھن کی ڈلی کی طرح ہاتھوں سے نکل گئی۔ میرے زندگی کے سارے رنگ ساتھ لے گئی اور میں ایک بار پھر سنگل

وومین (Single Woman) بن گئی۔ بلکہ ایک بار پھر یتیم ہو گئی۔

نظمی اچھا لڑکا ہے۔ کینیڈا میں ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر لڑکی کے لیے ڈاکٹر شوہر ہی موزوں رہتا ہے میرے خیال میں۔ سال بھر بعد واپس لوٹیں گے دونوں۔ پھر یہیں رہائش رہے گی۔ مجھے چار بیڈروم کے فلیٹ کا کیا کرنا ہے۔

مگر ابھی تو حنا کو گئے ہوئے مہینہ بھی نہیں ہوا۔

"کیا جلدی تھی آپ کو میری شادی کی۔ میں ایم ڈی کر لیتی۔" وہ مہندی کی رات کو میرے گلے سے لپٹ کر لاڈلی سی آواز میں بولی تھی۔ گلے کی آمیزش کے ساتھ ہلکا ہلکا احتجاج لیے ہوئے۔

"میں تو سمجھی تھی تم بہت خوش ہو اس رشتے سے۔" میں روہانسی ہو کر بولی تھی۔

"دکھی بھی نہیں ہوں۔ مگر میں نے سوچا کہ آپ اتنی خواہش مند ہیں مجھے دلہن بنانے کی تو"۔ اس نے میرے گلے سے باہیں الگ کر کے نیچے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اصل میں میں نے اسے نظمی کی کمپنی (Company) میں بہت خوش دیکھا تھا۔ یا ایسا سمجھا تھا کہ جب وہ آتا تو خوب قہقہے لگتے۔ حنا باورچی خانے میں میرا ہاتھ بٹاتی۔ مجھے کھینچ کھینچ کر ڈرائنگ روم میں لے جاتی اور لطیفوں اور دلچسپ واقعات میں شریک کرتی۔ ہنستی ہنساتی رہتی۔

اور میں یہ سمجھی کہ ...... یہ سوچ کر کہ کہیں اس کی خوشیوں میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ میں نے جلدی میں رشتہ ......

رخصتی کے دن میں اسے کتنی باتیں کہنا اور سمجھانا چاہتی تھی مگر وہ الٹا مجھے ہی سمجھائے جا رہی تھی۔

"سیما کے پارلر سے بال نا بنوایئے گا امی ...... وہیں جایئے گا حبیب کے ہاں ...... برباد کر دیتی ہے وہ آپ کے بال ...... اور ہاں امی یہ جنریٹر بدلوا دیجیے گا۔ میں کب سے کہہ رہی ہوں۔ دیکھیے اس کی ڈوری آپ سے کھنچے گی نہیں ...... ہاں ...... بازو دکھے گا تو لکھیں گی کیسے ...... رخسانہ کو کہیے گا کہ اپنے بیٹے کو یہیں لے آئے۔ اور گھر نہ جایا کرے شام کو۔ اب اس فلیٹ میں آپ اکیلی ہوں گی تو ......" وہ زور زور سے بولتی ہوئی اچانک خاموش ہو جاتی۔ مجھے سینے کے اندر سے دھک کی آواز سنائی دیتی ...... پازیب کی جھنکار بند ہو جاتی تو میں اس کی طرف غور سے دیکھتی ...... وہ رندھی ہوئی آواز کو کامیابی سے قابو میں لاتی ہوئی

کہتی ...... ''اب اکیلی ہیں تو ......'' وہ کچھ نکلتی ...... ''تو یہ ٹانک لینامت بھول جایئے گا۔اس میں کیلشیم اوروٹامن کے ساتھ ساتھ بی کامپلیکس اور آئرن بھی ہے۔''

''افوہ...... بتایا ہے ناتم نے مجھے کئی دفعہ میری اماں۔'' میں مجروح سی آواز پر ہنسی کا بینڈایڈ (Bandaid) چپکا کر کہتی۔ اور وہ اور میں دونوں ہنس دیتے۔ اور شادی میں آئے مہمان بھی۔ ہم دونوں کے علاوہ اپنی اپنی اور ایک دوسرے کی حالت کا اندازہ کسی کو نہ ہوتا۔

بچھڑتے وقت وہ زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑائی تھی۔ شاخِ گل سا سجا سنورا اس کا نازک سا وجود ہر ہچکی کے ساتھ ہچکولے کھاتا۔ میں اسے سنبھالنے کے بہانے خود طوفان کی زد میں آئی نیا سی ڈولتی، لبوں تک آئے دم کو قابو میں رکھے، اسے وداع کر آئی۔ اور جب سے۔جب سے اب۔ نسیم سحر سے دوستی ہونے تک ماہی بے آب سی تڑپتی رہی۔ رخسانہ اپنے بچے کو لے کر ہمارے ہاں آگئی ہے۔

حنا کے جانے کے بعد میں پہلی بار گھر سے نکلی ہوں۔

ہوا تیز چلنے لگی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں میں ٹھنڈ سی محسوس ہوئی تو میں نے گلے سے لپٹی شال پھیلا کر اوڑھ لی۔ قریب ہی سے کوئی کوا بول اٹھا۔ لہراتی ہوا میں پھولوں کی مہک شامل ہو گئی تھی۔ میں نے دور نظر دوڑائی۔ پہاڑوں کے قریب آسمان کی سیاہی میں نیلاہٹ گھلا چاہتی تھی۔ سامنے ایک کشادہ باغیچہ تھا۔ میں نے کیاریوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک چکر کاٹا۔ میرے بال پھر کھل گئے تھے۔ چاہے کسی بھی انداز سے بناؤں میں انھیں مگر یہ اس قدر ملائم ہیں کہ جوڑا پھسل پھسل جاتا ہے۔ موباف سے نکل آتے ہیں اور ہیئر پن ڈھیلا ہو کر گر جاتا ہے۔ جبھی تو حنا نے انھیں ترشوالیا تھا۔اب کچھ بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے تھے تو میں نے انھیں ربر بینڈ میں سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس وقت پھر ربر سے کسی طرح پھسل کر ...... اگر حنا ہوتی تو سفر سے پہلے ضرور میرے بال سیٹ کروا لیتی۔

میں نے کمرا تو دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے اندر جانا ہو گا۔اس منظر کو چھوڑ کر ......

فرحتِ دیدن گل آہ کہ بسیار کم ست
آرزوئے دلِ مرغانِ چمن بسیار ست

میں اندر جاتے ہی حنا کی تصویر میز پر سجادوں گی۔ دن میں کئی کئی بار تو دیکھتی ہوں میں اس کی تصویر۔ اور کل رات سے میں نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اندر جانا

چاہیے۔

میں زینے کی طرف مڑی تو پیچھے سے مجھے کسی کے دوڑنے کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی ہلکی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اسپورٹس شوز اور ٹریک سوٹ (Track Suit) میں۔ داڑھی سفید تھی اور سر کے لمبے سفید بال سر کے اوپر ایک رومال میں بندھے ہوئے تھے۔ مگر انداز خاصا پھرتیلا تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا تو آواز آئی۔

"گڈ مارننگ۔" وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھے اور آواز میں سانس کا تیز اُتار چڑھاؤ واضح تھا۔

"گڈ مارننگ۔" میں نے جلدی سے کہا اور اندر کی طرف قدم بڑھادیے۔ بدلتے موسموں کی مہربانی سے مجھے اس قدر محتاط رویے کو خیر باد کہہ دینا چاہیے تھا۔ مگر مجھ میں کم اور حنا زیادہ نظر آتی۔ لوگ کہتے تھے۔

اس لیے اس فطری احتیاط سے میں دامن نہ چھڑا سکی تھی......

حنا کی میرے شانے پر رخسار رکھے ہوئے کھنچی تصویر کو بوسہ دے کر میں نے کپڑے الماری میں ہینگروں پر لٹکا دیے۔ گرم پانی سے غسل کیا اور اُس ذی الجلال مبین کو یاد کیا۔

ڈائننگ ہال میں خاصے لوگ تھے۔ ۴۰ اور ۷۰ کے آس پاس کے سن کے، جیسے کہ اس طرح کے، یونیورسٹیوں کے بعد کی توسیعی تعلیم کے اداروں سے متعلق اشخاص ہوا کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں سے شناسائی تھی۔ کچھ اجنبی تھے۔ ایک میز پر صبح والے سردار صاحب لطیفے سنا رہے تھے۔ ایک خاتون میری پہچان کی نظر آئیں۔ جو ہال میں کئی لوگوں سے واقف نظر آرہی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی میرے پاس چلی آئیں۔

"نمسکار رِتو جی۔" سردار صاحب رِتو شریواستو سے مخاطب تھے۔

"ارے آپ...... کیسے ہیں، آیئے نا"۔ رِتو نے کرسی کھینچی۔

"یہ فوزیہ سلیمان ہیں۔ بہت اچھی فنکارہ...... فوزیہ! یہ تبسم صاحب ہیں۔" رِتو نے مجھ سے کہا "سریندر سنگھ تبسّم۔"

"آداب محترمہ...... میں نے شاید آپ کو صبح دیکھا تھا۔ تعلیمی ہفتے میں شرکت کے لیے تشریف لائی ہیں۔ زہے نصیب۔" وہ میری طرف دیکھ کر کھڑے ہوئے۔ میں نے بھی اٹھ کر تسلیم کیا۔

"فوزیہ تم حیران ہو گی کہ سردار صاحب اور یہ نفیس اردو۔ آپ دراصل انگریزی کی پروفیسر شپ سے ریٹائر ہوئے ہیں، پنجابی میں کئی ناول تحریر کیے ہیں، اردو کے کچھ بڑے بڑے ناولوں کا ترجمہ کیا ہے۔" رِتو نے کہا تو تبسّم صاحب نے فوراً بات کاٹی۔

"رِتو جی کیا پورا بایو ڈاٹا (Bio-data) ہی پیش کر دیں گی"۔ سردار صاحب خوش دلی سے ہنستے ہوئے بولے۔

"اور کیا ہو رہا ہے آج کل سر" رِتو نے پوچھا۔

"پنجابی ادب کی تاریخ پر کتاب لکھ رہا ہوں۔ اب تو سال بھر سے یہیں ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ کچھ خاموش ہو گئے۔

جب ہم لوگ سیمنار روم میں داخل ہو رہے تھے تو تبسّم صاحب مختلف لوگوں سے مل رہے تھے اور دوسروں سے بھی ملوا رہے تھے۔ جس کا ذکر کرتے، اس کی صدق دلی سے تعریف بھی کرتے جو اکثر لوگ نہیں کرتے۔ کسی کی چھوٹی سی خوبی کو بڑھا چڑھا کر سراہتے۔ اور ایسا کرتے ہوئے ان کے چہرے پر پُر خلوص سے تاثرات چھا جاتے۔

دن دلچسپ گزرا۔ تازہ ہوائیں۔ کام۔ پڑھے لکھے لوگ۔ مباحثے، ہلکا پھلکا لنچ......اور لنچ کے فوراً بعد مقررین کو سنتے ہوئے، سوچنے کے بہانے پل دو پل کی جھپکیاں لیتے ہوئے حاضرین۔

شام کو کمرے میں لوٹی۔ کچھ کتابوں کو دیکھا، کچھ مقالے کو بھالا۔ بالکنی میں آئی۔ غروبِ آفتاب کا بہترین منظر نظر آ رہا تھا۔ بھٹی میں تپے ہوئے گھڑے ایسا قرمزی رنگ کا خورشید اپنی جسامت سے بڑا نظر آ رہا تھا۔ ایک پرندہ سورج کے کہیں قریب ہی چکر کاٹ رہا تھا۔ باقی پرندے ٹولیوں میں بٹے سورج کے آس پاس ہی جیسے پرواز کر رہے تھے۔

"حنا ذرا باہر تو آنا" میں نے پلٹ کر حنا کو پکارنا چاہا۔ آواز زباں بنتے بنتے لوٹ گئی۔

کتنی خاموشی تھی۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لوگ شاید مارکیٹ کی طرف گئے ہوں گے۔

تبسّم صاحب کہیں سے آ رہے تھے۔ اسپورٹس شوز پہنے ہوئے۔ مگر اس وقت ان کی چال میں صبح والی چستی نہیں تھی۔ آہستہ چل رہے تھے۔ دونوں طرف پیڑوں اور سبزے کو دیکھتے ہوئے۔ بیچ بیچ میں رُک بھی جاتے۔ شاید کسی جھینگر پر غور کرنے کے لیے۔ ہاتھ میں

ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ جسے کبھی گھماتے اور کبھی عصا کی طرح ٹیکتے۔

بالکنی کے سامنے سے گزرے تو ہاتھ سے ویو (Wave) کیا۔ میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد جب میں لائبریری کی طرف جانے لگی تو تبسم صاحب سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ سر جھکائے ہوئے، جیسے کسی سنجیدہ مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں ہوں۔ کچھ غمزدہ سے بھی نظر آ رہے تھے۔ یا شاید طبیعت ناساز ہو۔

''آداب آداب۔'' مجھے دیکھتے ہی بولے۔

''جی آداب''۔

''چائے پی جائے؟ اگر آپ فری (Free) ہوں تو...... '' آداب کہتے وقت ان کے چہرے پر رونق سی آ گئی تھی۔ چائے پینے کا خیال ظاہر کرتے وقت رونق ایک ٹھہری ہوئی سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور آخری جملہ کہتے ہوئے وہ اس قدر اداس نظر آنے لگے کہ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہی دیر میں رونے والے ہوں۔

''رتو بازار گئی ہے۔ بس ذرا آ جائے تو۔'' میں نے سڑک کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تب تک ہم ڈائیننگ ہال کی طرف چلتے ہیں؟'' انھوں نے اس انداز سے کہا جیسے انھیں یقین ہو کہ میں ہال کی طرف جانے والی نہیں ہوں۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں...... جی ہاں...... شام کو بس...... انسان جیسے بیمار سا ہو جاتا ہے یہاں۔'' وہ جیسے کہ کوئی مہلک مرض چھپا رہے ہوں۔

''دن میں خاصے ایکٹیو تھے آپ...... اس وقت''۔

''نہیں تو...... میں بالکل ٹھیک ہوں...... بہت بہت شکریہ۔''

''آپ سیر کے بہت شوقین معلوم ہوتے ہیں۔ ویسے انسان یہاں سیر نہ کرے تو پھر اور کہاں کرے...... یہ تازہ ہوائیں...... ہریالی''۔

میں نے سوال کے ساتھ خود ہی جواب جوڑ دیا۔

''جی ہاں...... مگر اب سیر بھی کتنی کرے انسان...... میں دراصل دیکھ رہا تھا کہ یہ سب لوگ...... شاید کوئی مل جائے۔ باتیں واتیں ہوں، چائے ہو''۔ ان کی آواز میں کرب سا اتر آیا تھا۔

حنا آج بے طرح یاد آرہی تھی مجھے۔ وہ ساتھ ہوتی تو ہم دونوں اس لمبی سڑک پر ایک طویل چکر لگا کر آتے۔ بہت سی باتیں کرتے ہوئے۔ ان چار دنوں کو اور خوبصورت طرح سے گزارنے کے پروگرام بناتے ہوئے...... مگر یہاں دور تک نیم انسانی صورتوں میں صرف سیاہ رو لنگور نظر آرہے تھے۔ ''سٹڈی ویک'' (Study Week) کے بڑے سے بینر پر ایک قمری چونچ بھینچے، اپنے ننھے، بھورے رنگ کے مہین مہین پروں والے حلقوم کو جنبش دیتی ہوئی کُک۔ کُک کی صدائیں لگاتی ہوئی اپنے چھوٹے سے سر کو ہلا کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی جانے کسے پکار رہی تھی۔

اگر اس کا حلق پھولتا پچکتا نہیں تو اس کی بند چونچ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ہرگز ممکن نہ تھا کہ یہ آوازیں وہی لگا رہی ہے۔ یہ آوازیں فضا میں کچھ اس طرح تحلیل ہوتیں جیسے کہیں دور سے سنائی دے رہی ہوں۔ سامنے ایک شخص چائے کے خالی برتن لے کر کسی کمرے سے نکل رہا تھا۔

''دراصل یہاں...... ان پہاڑوں پر شامیں اُداس ہوا کرتی ہیں۔'' تبسم صاحب نے ڈوبی ڈوبی سی آواز میں کہا۔

''ہاں، واقعی'' جانے یہ جملہ میں نے فوراً ہی کیوں کہہ دیا۔

''آپ کو بھی محسوس ہوا نا......'' وہ انگلی میری طرف اٹھا کر بولے۔

''شام گزارنا ایک مسئلہ ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ تو ایسا ہی ہے'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ اور کہیں دور دیکھتے ہوئے چلنے لگے۔

دور سے ریتو کسی کے ساتھ آتی دکھائی دی تو میں بھی تبسم صاحب کے ساتھ چلنے لگی۔

''شام گزارنے کے لیے کوئی دلچسپ سا مشغلہ ڈھونڈ لیجیے نا''۔ میں نے کہا۔

''ہاں سوچا تھا۔ بلکہ دو مہینے پہلے جب آفریدی صاحب...... تھے تو...... سوشیالوجسٹ (Socialogist) ہیں آپ جانتی ہوں گی مشہور ماہر سماجیات ہیں...... وہ اور میں بیڈ مینٹن کھیلا کرتے تھے ہر شام...... وقت کیسے گزرتا پتہ ہی نہ چلتا۔'' تبسم صاحب کے چہرے سے خوشی پھوٹنے لگی۔ ''مہینہ بھر خاصے ہنگول رہے ہم۔ کبھی کبھی سہ پہر بھی ساتھ گزرتی۔ مگر پھر وہ چلے گئے......'' ان کا چہرہ بجھ سا گیا۔ مگر دوسرے ہی پل لوگوں کو بازار سے

لوٹتا دیکھ کر وہ کھل اٹھے۔

"وہ دیکھیے آپ کی رِتو جی بھی آ رہی ہیں۔ یہ خاتون جوان کے ساتھ ہیں یہاں فیلو ہیں ایک عرصے سے۔ بہت مصروف رہتی ہیں۔ آج مدت بعد نظر آ رہی ہیں یہ شام کے وقت۔ ورنہ بس لنچ ڈنر وغیرہ میں۔ وہ دیکھیے کچھ ہمارے یار لوگ بھی آ رہے ہیں پیچھے پیچھے۔"

آخری جملہ کہتے وقت ان کی آواز کی چہک نمایاں تھی۔

سبھی ساتھ ساتھ ڈائننگ ہال پہنچے۔

"یہ مسز ترویدی ہیں۔" رِتو نے کہا تو میں نے آداب کہا۔

"رِتو کہتی ہے تم بہت اچھا لکھتی ہو۔" انھوں نے محبت اور اپنائیت سے کہا۔

"بور تو نہیں ہو گئیں نا یہاں؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی بس ذرا سا کسی وقت...... رِتو بھی نہیں تھی نا...... تو"۔

"رِتو...... "میرے کمرے میں آ گئی تھی۔ پھر ہم ذرا بازار کی طرف ہو لیے۔ مجھے کچھ پھل وغیرہ خریدنے تھے اور اسے پتہ نہیں کیا کیا"۔ مسز ترویدی ہنس دیں۔ وہ ایک دبلی پتلی جسامت کی پچھتر چھہتر کے سن کی مشفق سی خاتون تھیں۔ صاف رنگ۔ گہری گہری آنکھیں۔ بال چند ایک کو چھوڑ کر سب سفید۔ چہرے پر لکیریں ہی لکیریں مگر باریک، جو جلد میں پڑی تھیں۔ گہری جھریاں نہیں۔ مسکراتیں تو بچوں کی سی معصوم نظر آتیں اور بات کرتیں تو محبت کے سارے معنی سمجھ میں آنے لگتے۔

"آپ تو کبھی بور نہیں ہوتیں میڈم......! تبسّم صاحب سب کی طرف باری باری دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ان کا چہرہ خاصا بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس سوال میں مجھے بھی دلچسپی تھی۔

"پہلے پہل جب شہر سے ایک دم یہاں آئی تو...... خالی خالی سا لگتا۔ ادھر گھر میں بھی بچے اپنی اپنی دنیاؤں کے ہو گئے تھے۔ کچھ ایسا فرق بھی نہیں پڑا مگر پھر بھی یہ سکوت کہیں اندر سے خاموش سا کر دیتا۔ حالانکہ دن خاصی مصروفیات میں گزرا کرتا اور کرنے کو اور بھی بہت کچھ ہوتا۔ مگر پھر بھی ایک احساسِ تنہائی سارے وجود پر مسلط رہتا۔ سیمینار وغیرہ ہوتے تو چہل پہل ہوتی...... مگر میں نے خود کو کبھی اداس نہیں ہونے دیا۔"

"پھر......؟" تبسم صاحب ہمہ تن گوش تھے۔

"بتاتی ہوں بھئی...... "وہ ہنس دیں۔ شفاف سا ناپا تلا قہقہہ۔

"اگر دیکھا جائے تو انسان ہمیشہ اپنا بار اٹھاتا پھرتا ہے۔ بچپن میں انجانے میں اور بڑا ہو کر دانستہ ...... کوئی بھی ساتھ چل پڑے تو وہ اپنے وجود کو خود ہی اہم سمجھنے لگتا ہے...... بڑے بڑے الفاظ میں اسے موہ مایا وغیرہ کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ صاف الفاظ میں یہ دوسروں پر انحصار کرنے والی بات ہے اور کچھ نہیں۔"

"مگر یہ بات دماغ کہاں قبول کرتا ہے میڈم۔" تبسم صاحب افسوس ناک سے لہجے میں بولے۔

"آپ کو تو کوشش کرنا چاہیے۔ اور آپ اپنے ذہن کو تیار کر سکتے ہیں اس بات کے لیے۔ اصل میں ہم جس طرح رہنا چاہتے ہیں یہ ہمارے اپنے ہی ہاتھ میں ہے۔"

"جیسے؟" رِتو بولی۔

"وہ اس طرح کہ جو ہمیں میسّر ہے۔ ہم اس کے مطابق اپنی ضروریات وضع کر لیں۔ میں نے بھی ان باتوں کی معراج یہاں آکر ہی حاصل کی۔"

"مگر میرے ساتھ الٹا ہوا ہے۔ میں یہاں آکر......" تبسم صاحب کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔

"میں یہ ہی تو کہہ رہی ہوں۔ میں بھی دن بھر کے کام کے بعد شام میں ایک لمبا چکر لگا آنے کے باوجود وقت کو منہ پھاڑے کھڑا دیکھتی۔ اور رات کے کھانے تک کا وقفہ جب بھی طویل محسوس ہوتا۔ اب چونکہ لکھنے پڑھنے کے کام کا زیادہ حصہ میں رات میں کیا کرتی ہوں۔ اس لیے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ شام کیسے گزاروں۔"

"میری سمجھ میں آگیا" رِتو چٹکی بجا کر بولی، "کھیل کر یا کوئی میگزین دیکھ کر یا...... یا پھر بازار گھوم کر......"

"کھیلنے کے لیے بھی ساتھ چاہیے کسی کا...... ہے نا...... صبح سیر کر لیتی ہوں لمبی سی۔ پھر ذرا سی شام کو بھی...... پھر بھی...... یہ وقت...... اخبار رسالے وغیرہ میں ناشتے کے وقت کے آس پاس دیکھ لیا کرتی ہوں۔" وہ سمجھانے کے انداز میں ہاتھ میز سے ذرا سا اٹھا کر بولیں۔ ان کی سفید کالی مہین مہین لکیروں والی ساڑی ان کے بالوں سے نہایت پروقارانہ سے انداز میں میل کھا رہی تھی۔ اور ان کی مسکراہٹ کا اسرار انھیں عجیب طرح کا تقدس بخش رہا تھا۔

"عبادت کر کے۔" میرے منہ سے اچانک نکلا۔

"سیانی ہے۔"مسز ترویدی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"عبادت صبح تو کرتی ہوگی...... "انھوں نے پوچھا"ہر ایک کرتا ہوگا اپنے اپنے طور سے...... ہے نا...... "انھوں نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

"کچھ دیر ذرا گہرائی سے اس کا تصور کر کے دن شروع کرے انسان تو من پر سکون، شانت رہتا ہے۔ جیسے ہم نے ہر کام اس کو سونپ دیا ہو۔ وہ جو ہر چیز پر قادر ہے...... "انھوں نے اوپر کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔

"ہمارے سوچنے سے کیا ہو سکتا ہے۔ اُداس ہو کر ہم دوسروں سے ذرا ذرا سا پیار اور اہمیت مانگ کر وقت گزارا بھی کریں تو تہی دامن ہی رہتے ہیں۔ خوشی کے لیے ہم دوسروں پر منحصر ہوں۔ اس سے بڑی نادانی کیا ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی طرف سے بہتر کر سکیں۔ خود کے لیے...... دوسروں کے لیے...... چلیے دوسروں کے لیے بہتر نہ بھی کریں، مگر کسی کو تکلیف بھی نہ دیں...... اور باقی اس پر چھوڑ دیں۔ اس کے ہو جائیں تو خوشی اندر سے، ہمارے دلوں سے پھوٹتی ہے۔ ہمیں اس کی تلاش میں مارا مارا نہیں پھرنا پڑتا۔ صبح اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یا کبھی کبھی کرتے ہوں۔ ذرا سا شام کو بھی دھیان کر لیں تو چوبیسوں گھنٹے مکمل ہو جاتے ہیں۔ جو وقت اذان کا ہوتا ہے، آرتی کا ہوتا ہے، ارداس کا، پاٹھ کا، کچھ بھی کہہ لیجیے۔ جب سورج اپنا فرض نبھا چکتا ہے، رات اپنی حکمرانی پر آیا چاہتی ہے۔ ماحول میں شور بھی کم ہوتا ہے۔ کتنا حسین وقت ہوتا ہے وہ۔ اب اُس کا ذکر آپ اگر شام کو بھی کرتے ہیں تو ذرا اور زیادہ وقت کے لیے کر لیا جائے۔ وقت بچا کر تنہائیوں کے سپرد کیوں کیا جائے۔ اُس سے لو کیوں نہ لگائی جائے جو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔ پھر آپ وقت گزارنے کے بہانے نہیں ڈھونڈیں گے، وقت ہی آپ کا منتظر ہوگا۔ ذرا سا باہر سے لوٹ کر اپنے اندر سمٹ آیئے۔ اپنے اور اس پرم شکتی، اس محبوبِ حقیقی...... اُس سچے پریمی کے اور قریب ہو جایئے۔ پھر بس سکون ہی سکون...... آپ خوشیاں مانگیں گے نہیں، بانٹیں گے۔ آپ کا اندر روشن رہے گا اور آپ یہ روشنی دوسروں کو دیں گے۔ "انھوں نے دونوں ہاتھ میز پر اوندھے رکھ دیے اور مسکراتے ہوئے ہمارے چہروں کا جائزہ لینے لگیں۔

جب ہم لوگ راہداری سے گزر رہے تھے تو رِتو میرے ساتھ چل رہی تھی اور تبسم صاحب اور مسز ترویدی آگے آگے۔

"جب بھی ان کے ساتھ ہوتی ہوں تو مجھ پر کسی نئی خوشی کا انکشاف ہوتا ہے۔" رتو بولی تو تبسم صاحب پیچھے مڑے۔

"اس لیے کہ زندگی پرانی ہو جائے تو جینے کے لیے نئے طریقے چاہئیں۔ مجھے یہ راز پہلے معلوم ہوتا تو سال بھر سے اپنی شامیں بندروں سے گفتگو میں برباد نہ کرتا۔" انھوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پہاڑیوں سے ٹکرا کر ان کا قہقہہ ہمارے پاس لوٹ آیا تو ہم سب بھی ہنس دیے:

سمجھے تو گھر میں رہے پرسا پلک لگائے
تیرا صاحب تجھ میں انت کہو مت جائے

کبیرؔ نے کہا ہے یہ۔"

مسز ترویدی نے مڑ کر ہمیں دیکھتے ہوئے کہا:

"بنا پریم دھیرج نہیں برہا بنا بیراگ
ست گرو بنا نہ چھوٹیے من منسا کی آگ

یہ بھی کبیرؔ نے کہا ہے۔"

تبسم صاحب پُر سکون سی مسکراہٹ لیے ہم سب سے بولے۔

اور پھر وہ شامیں۔ سب کی ہی شامیں پُر سکون گزری ہوں گی کہ میں نے پھر کسی شام تبسم صاحب کو نہیں دیکھا۔ یا وہ نظر نہ آئے یا میں شاموں کو باہر نہ نکلی۔ یا ہم دونوں ہی۔

اس فلیٹ سے حنا کی ان گنت یادیں وابستہ ہیں۔ آسمان مٹ میلا سا ہے۔ ہوائیں صاف نہیں ہیں۔ فضا میں دھندلا دھندلا دھواں ہے۔ باہر شور ہی شور ہے۔ یہاں حنا کی چیزیں، تصویریں، باتیں، خوشبو، سب ویسے ہی ہے۔ آسمان کو دھویں نے چھپالیا ہے مگر بالکنی کے نیچے کی یہ زمین میرے پاس ہے۔ یہاں سے میری آنکھیں دھوئیں کے اُس پار، دور عرش کے قریب پہنچ سکتی ہیں۔ بس ذرا سا میں انہیں موند کر اپنے اندر سمٹ جاؤں میرے اندر کی خاموشی کو باہر کا شور مجھ سے نہیں چھین سکتا۔ یہ سکوت میرے ابدی سکون کا پیامبر ہے، پھر روح پرور سحر تو میری اپنی ہے ہی۔ اور حنا اپنے گھر میں خوش ہے۔

□□

("ایوانِ اردو" دہلی ۲۰۰۰ء)

بابل

نازک سی لڑکی کی آنکھوں میں لبالب آنسو بھر آئے تھے۔
ابھی لحہ بھر پہلے تک وہ خوش نظر آرہی تھی۔ ہنس بھی رہی تھی۔ادھیڑ عمر کی خاتون کے ساتھ آس پاس کھڑے رشتہ داروں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔ لڑکی کا رنگ سنہرا تھا۔چہرا کتابی۔ آنکھیں نہ زیادہ بڑی اور نہ چھوٹی۔ لب پتلے،نازک سے،اوپر کا ہونٹ ذراسا آگے کو تھا، جس کی وجہ سے نچلا ہونٹ بالائی دانتوں کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹی سی ٹھوڑی کے ساتھ لمبی نازک گردن۔اس کے گیردے رنگ کے قمیض سلوار کے گریباں پائچوں اور آستینوں پر سیاہ رنگ کی باریک کڑھائی سے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں کلائیوں تک مہندی رچی ہوئی تھی اور کانچ کی ڈھیروں چوڑیوں کے دونوں طرف دودو سنہری کڑے تھے۔ سر سے لمبی سی کمر تک آتا ہوا دوپٹہ۔ لمبا پتلا مگر متناسب جسم۔اس کی عمر سترہ،اٹھارہ برس ہوگی۔

ٹرین چلنے میں کچھ دس ایک منٹ ہوں گے۔ سنہری رنگت والی نازک سی دلہن نما لڑکی معمر خاتون کے ساتھ اور کبھی ایک گوری سی اپنی سے عمر میں کچھ چھوٹی لڑکی کے ساتھ باتیں کررہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جب وہ پلیٹ فارم پر آئی تھی تو ان دونوں کے ساتھ چہک چہک کر بول رہی تھی۔اور لوگ بھی ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ان میں ایک چودہ پندرہ سالہ سانولا سا لڑکا بھی تھا۔دلہن جب خاتون کے ساتھ باتیں کررہی تھی تو وہ دونوں کے درمیان کھڑا ان کے چہروں کی طرف باری باری دیکھتا تھا۔جب وہ گوری سی لڑکی کو کچھ کہتی تب بھی وہ دلہن کے بہت قریب کھڑا کبھی اپنا گال اس کے سامنے کرتا کبھی خود اس کے رخسار کا بوسہ لیتا۔اُس کی تھوڑی پر اور کانوں کے قریب کچھ سیاہ بال اُگے ہوئے تھے۔ان

لوگوں میں گہری سانولی رنگت کے دو مرد بھی تھے، ایک اٹھارہ، انیس برس کا ہوگا اور دو
تیس، بتیس سال کا جس کا قد اور جسم درمیانہ بال چھدرے مگر گھنگھریالے اور تمام چہرے
داغ۔ اس نے سیاہ چشمہ پہن رکھا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی...... سرکار سترہ، اٹھارہ برس پہ
اشتہار لگوایا کرتی تھی، چیچک کا پتہ بتائیے۔ ایک ہزار روپیہ کا انعام پائیے' اور اب تو کوئی دہا
بھر سے 'ایسا اشتہار بھی دیکھنے میں نہ آیا۔ یعنی چیچک بالکل ناپید ہو چکی ہے۔ اگر ایسا تھا تو ا
آدمی کے چہرے پر...... ؟ ان دنوں پھر بھی کچھ وقت تھی ہزار روپے کی مگر اب...... اور پھ
کون جانے اطلاع دینے پر ملا بھی کرتے تھے وہ ہزار روپے؟ یا صرف یہ ظاہر کرنے کے ل
کہ اس مہلک بیماری پر قابو پالیا گیا ہے، اشتہارات دیئے جاتے۔ اگر قابو پالیا گیا ہوتا تو......
ہو سکتا ہے یہ چیچک نہ ہو، چھوٹی چیچک ہو مگر اس کے داغ چھوٹے اور گہرے نہیں ہوتے
نسبتاً بڑے اور چوڑے ہوا کرتے ہیں۔ اور پھر تعداد میں مقابلتاً کم ہوتے ہیں۔ جس تناسب
سے اس کا چہرہ داغدار تھا، اس لحاظ سے اس کی آنکھوں کا بچ پانا مشکل تھا۔ مگر وہ تو ٹھیک سے
دیکھ رہا تھا۔ سیاہ چشمے کے پیچھے سے۔ اس نے گہرے ہرے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی اور اس
کے ساتھ سفید قمیض۔ اس سے چھوٹے والے شخص نے چمکتے ہوئے سیاہ جوتے' اور کسی
موٹے کپڑے کی پتلون اور جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔

گاڑی نے سیٹی دی تو دور سے تیز رفتار سے چلتا ہوا ایک بزرگ لڑکی کے پاس پہنچا اور
اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ تھما کر چشمے والے آدمی کے پاس گیا اور ایک خوبصورت سر
شال اس کے کندھے پر لٹکا دیا۔ اس آدمی نے شال کو دوسرے ہاتھ سے چھوا اور مسکرا کر
بزرگ سے کچھ کہا۔ بزرگ نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

خاتون' چھوٹی لڑکی اور بزرگ ٹرین میں سوار ہو گئے۔ دلہن سی لڑکی کھڑکی تک آئی
اور مسکرا کر خاتون کے ہاتھ پکڑ لیے۔ خاتون نے ایک ہاتھ اٹھا کر اس کا چہرہ سہلایا۔ پھر اس
کے سر پر ہاتھ پھیرا......

یہ ہی وہ لمحہ تھا جب پچھلی نشست پر بیٹھی کافی دیر سے انہیں دیکھتی ہوئی میں اداس ہو گئی
تھی...... خاتون کا سر پر ہاتھ پھیرنا تھا کہ دلہن سی لڑکی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور آنسو کا ایک
قطرہ کسی پلک پر اٹک سا گیا۔ لڑکی حنائی انگلیوں سے ابرو کو کھجاتی ہوئی آنسو کو چھپانے کی
کوشش کرنے لگی تو میرا دل درد سے بھر آیا۔ پتہ نہیں اس کے دکھ کو میں نے اس شدت سے

کیوں محسوس کیا۔ جب اس نے ماتھے سے ہاتھ ہٹا کر خاتون کے چہرے کی طرف دیکھا تو جانے کس کس جذبے کے تاثرات اس کے اپنے چہرے پر یکجا ہو گئے تھے' ویسے اس کی صورت کچھ ایسی تھی کہ جیسے کسی حکم کی منتظر ہو۔ یا کسی سوال کا جواب سمجھ رہی ہو۔ کچھ ڈھونڈتی ہوئی آنکھیں، ذرا سا کھلا ہوا دہانہ۔ دو دانتوں کو چھوتا ہوا لب اور نازک سی صراحی دار گردن۔ مگر اس وقت اس کے چہرے پر سوال و جواب' مجبوری و رضا، دکھ، محبت گلہ اور نہ جانے کیا کیا ایک ساتھ نظر آرہے تھے......

اگر اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور نشیلی ہوتیں 'لب بھرے بھرے 'اور بدن بھرپور ہوتا، تو آنکھوں میں اشک لئے اس کا پُرکشش سراپا اور زیادہ جاذب ہو جاتا۔ اس کے دل کا درد اس کے حسن کے پیچھے کہیں چھپ جاتا...... مگر بنانے والے نے اسے کچھ ایسا بنایا تھا کہ اسے دیکھ کر ہر جذبے پر انسانیت کا جذبہ حاوی ہو جاتا' اس کا دکھ اپنا دکھ معلوم ہونے لگتا۔

اور اب نرگس کے کھلے پھول سا وہ چہرہ اداس تھا اور میری سمجھ میں ساری کہانی آگئی تھی۔

اس کی مہندی کے رنگ سے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ تین چار دن پہلے اس جگہ بیاہی گئی تھی۔ اور وہ بزرگ اور خاتون اس کے والدین تھے۔ گوری سی لڑکی اس کی چھوٹی بہن تھی۔ اور باقی لوگ اس کے سسرال والے۔ نئے جوتوں والا آدمی اس کا شوہر ہوگا اور سیاہ چشمے والا جیٹھ 'اور وہ نو عمر لڑکا اس کا دیور ہوگا۔

ٹرین سرکنے لگی تھی خاتون کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے کھڑکی سے لگی دلہن کا سر اپنے گریباں کے قریب چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کی بہن رو پڑی۔ اس کے والد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور مجھے اندازہ ہوا کہ ہماری نہیں بلکہ برابر والے پلیٹ فارم پر ٹھہری ہوئی گاڑی رینگ رہی تھی اور اب ہماری گاڑی چلنے لگی تھی۔ اس کے باپ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا اس کے ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ وہ چلتی ہوئی ٹرین سے بیٹی کو دور ہوتے ہوئے دیکھ کر آنسو پینے کی کوشش میں تھا' اور بیٹی وہیں کھڑی اپنے اداس ہاتھوں کو آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ اس کے نئے رشتہ دار بھی کچھ دوری پر مسکرا مسکرا کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔

ہماری گاڑی چل چکی تھی۔ مگر میں وہیں کہیں ٹھہر گئی تھی۔ پلیٹ فارم پر روتی ہوئی دلہن کی اشک بار آنکھوں کے پاس۔ میرا دل بھی وہیں کہیں اٹک گیا تھا کہ...... کہ ٹرین کے نکل جانے سے لمحہ بھر پہلے میں نے ایک عجیب منظر دیکھا تھا۔

نئے جوتوں والا آدمی اور نو عمر لڑکا کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ چشمے والا آدمی لڑکی کی طرف جا رہا تھا۔ سورج کی کرنیں اس کے چہرے کے داغوں کو مزید واضح کر رہی تھیں۔ جب اس نے سر لڑکی کی طرف موڑا تو اس کے سیاہ چشمے کی کھلی طرف سے اس کی ایک آنکھ پر پڑتی ہوئی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ وہ آنکھ بے نور تھی۔ پتلی باہر کو ابلتی ہوئی اور بالکل سفید، میں سمجھ گئی کہ وہ دوسری آنکھ سے ہی دیکھ پاتا ہوگا۔ پتہ نہیں ٹھیک طرح سے یا بمشکل......

بہر حال چشمے والا آدمی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے پلیٹ فارم سے لے جانے لگا۔ اس نے لڑکی کا سر دوسرے ہاتھ سے اپنے اس شانے پر ٹکا دیا تھا جہاں لڑکی کے والد نے پہلے سے ایک شال رکھا ہوا تھا...... اوہ...... تو وہ اس کا جیٹھ نہیں شوہر تھا...... مجھے سینے کے اندر اپنا دم قید ہوا محسوس ہونے لگا۔ لڑکی سوگوار سی چل رہی تھی۔ دونوں دیور اس سے کچھ فاصلے پر ہنستے ہوئے آرہے تھے۔ یکلخت چھوٹا لڑکا دوڑ کر آگے بڑھا اور اس نے آنسوؤں میں ڈوبی سوگوار لڑکی کے پہلو پر پیچھے سے اچانک پنجہ مار کر زوردار قہقہہ لگایا۔ لڑکی گھبرا کر چیخ پڑی اور تینوں بھائی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

گاڑی نے رفتار پکڑ لی تھی۔

سامنے والی نشست پر بیٹھی خاتون رومال سے بار بار آنکھیں صاف کرتی ہوئی جانے کہاں دیکھ رہی تھی۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ جیتی جاگتی گڑیا ایسا ذی روح کھلونا ہچکیاں لیتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اسٹیشن سے باہر نکل کر کہاں کو جا رہا ہوگا۔

❑❑

("مریخ" پٹنہ، ۲۰۰۰ء)

پھول

سب کو سنبھالتا سنبھالتا، چھوٹو جب کچھ دنوں کے لیے چلا گیا تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کون سی چیز کہاں پر رکھی ہے۔ ہر وقت زبان سے بے خیالی میں اس کا نام نکل جاتا۔ جب آیا تھا تو شاید دس گیارہ برس کا رہا ہوگا۔ میرے بچے ہوئے تو اس نے زچگی میں میرا پورا دھیان رکھا۔ بچوں کو خوب خوب پالا۔ کھلانے سے کھیلنے تک سارے کام وہی کرتا۔ میں صرف ان کی نیپیز (Napies) وغیرہ بدلتی، نہلاتی، دھلاتی یا Feed کرتی ورنہ باقی سب وہ اپنی خوشی، اور مرضی سے کرتا۔

بلکہ اس نے ازل سے سُست ہمارے میاں کو بھی کسی فرمانبردار بیوی کی طرح اپنے کام کی تحویل میں لے لیا تھا کہ میں کافی عرصے تک بیوی کم اور اماں زیادہ رہی۔ اور بچے کبھی میرے پیٹ میں رہے تو کبھی گود میں۔ اوندھی لیٹ کر پلنگ کے نیچے سے جوتے چپلیں نکالنا میرے بس کی بات نہیں تھی اور نہ میں ہارن سنتے ہی بھاگ بھاگ کر زینہ طے کرنے کے لائق تھی۔ یہ سب کام چھوٹو نہایت خوش اسلوبی سے کرتا۔ یہ ذمہ داریاں اس نے خود ہی اپنے سر لی تھیں۔

ایک صبح اسے ہمارے کپڑے پریس کرنے والے کی بیوی لے آئی تھی۔ وہ پریس والے کا بھتیجہ تھا جسے کام سکھانے کے لئے اس کا بھائی چھوڑ گیا تھا۔ مگر اُس سے بھاری استری اٹھائی نہیں جاتی تھی۔ اُٹھا بھی لیتا تو اسے اپنے قد کے برابر میز پر پھیرنا اس کے بس سے باہر تھا۔

''ذرا آپ کے بچوں کے ساتھ کھیل لیا کرے گا۔ تھوڑا بڑا ہو جائے گا۔ پھر آپ بھی اکیلی ہوتی ہیں۔ گلی میں میں ہوں۔ اس کا چچا ہے۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

بولی۔ سر کے پچھلے حصے سے آگے کی طرف جاتے ہوئے اس کے ہاتھ کے ساتھ بال چھوٹو کی آنکھوں تک آجاتے اور وہ ان کو الٹے ہاتھ سے کنپٹیوں کی طرف سنوارتے ہوئے پلکیں جھپک جھپک کر مجھے دیکھتا جاتا۔

آبنوسی رنگت پر بھنورے کے پروں جیسی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، صاف ستھرے بڑے بڑے مگر ہم سطح دانت، نچلے آدھے ہونٹ تک آتے ہوئے۔ دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا جیسے مسکرا رہا ہو۔

"ہمارے یہاں رہو گے؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"ہن جی (ہاں جی)۔" اس نے چھوٹا سا سر بٹیر کی طرح ہلا کر کہا۔

"اچھا جی؟" میں نے اس کی طرح سر ہلایا تو وہ ہنس دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا تو وہ ایک دم ہنسی روک کر نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"دیوی پرشاد کنوجیا، گاؤں پھول نگر جلع (ضلع) اناؤ۔ اتر پردیش۔" اپنی شناخت بتاتے ہوئے اس کا چھوٹا سا سر اوپر اٹھا ہوا تھا اور سینہ پریڈ کر رہے فوجی جوان کی طرح تنا ہوا۔

"بہت اچھا نام ہے تمہارا مگر۔ کچھ لمبا نہیں ہے؟"

میں نے داہنا ہاتھ اپنے ابھرے ہوئے پیٹ پر رکھ کر اور بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اس کا رخسار چھو کر کہا:

"ہن جی۔"

"تو؟"

"تو جی؟" اس نے میرے تاثرات دیکھنے کے لئے پھر سر اوپر کر کے سوال کیا تو مجھے ہنسی آگئی۔

میں نے اس کے لئے کھانا پروس دیا۔ اور جب تھالی اس کے سامنے فرش پر رکھنے کے لئے جھکنے لگی تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہتھیلیاں رکابی کے کنارے سے لگا دیں۔

"مت جھکنا جی۔ میں لے لیتا ہوں۔" وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔

"تمہارا کوئی چھوٹا بھائی بہن بھی ہے نا۔" میں نے اس کی اس حرکت سے محظوظ ہو کر کہا۔ مجھے اس کی سمجھداری اچھی لگی۔

"ہن جی...... ایک چھوٹا بھائی ہے...... سال بھر کا...... آپ کو پہلے سے ہی پتہ تھا کیا؟...... اس کے ہاتھ اتنے اتنے سے ہیں...... اور پیر بھی......" اس نے دو ہاتھوں کی انگلیوں کو پاس پاس لا کر کہا۔ اور آنکھوں میں پیار بھری چمک لے کر مسکرانے لگا۔

میرے پاس بھی اس شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا۔ جو میری تکلیف میں ساتھ دیتا۔ ننھے ننھے جڑواں بچوں کے ایک جیسے تقاضے پورے کرنا میرے لئے ایک مرحلہ ہو جاتا، اگر خدا نے دیوی پرساد کو کسی دیوی کے پرساد کی طرح نہ بھیجا ہوتا۔

"میں تمہیں دیوی بلاؤں کہ پرشاد، یا پھر کنو جیا؟" میں نے پوچھا تھا "جو آپ کو پسند ہو جی...... آنٹی جی۔" وہ ہنس کر بولا تھا۔ مگر جب اسے میں نے اندر سے برآمدے کا بلب روشن کرنے کے لئے آواز لگائی تو اس کے مستقبل کا نام خود بخود میری زبان پر آ گیا۔

"ارے...... چھوٹے...... او چھٹکے۔" وہ آگے سے نہیں بولا۔

"چھوٹو...... او چھوٹو۔"

"آیا جی...... آنٹی جی۔" وہ بھاگتا ہوا آیا۔

"مجھے بلایا نا جی۔" وہ بھولی بھالی آنکھوں کو سوالیہ انداز میں پھیلا کر بولا تو مجھے پیار آ گیا۔ شاید اسے اپنا نیا نام پسند آیا تھا۔

"ہاں بیٹا۔ یہ اون کا گولہ پکڑا دو...... اور باہر بتی جلا آؤ۔ شام ہو گئی ہے۔" میری آواز میں ممتا سی گھل گئی اور میں اسے برآمدے کی طرف جاتا ہوا دیکھنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی پنڈلیوں پر ننھے ننھے پٹھے اس کے بچپن سے ہی محنت کش ہونے کی دلیل تھے۔

بجلی جلا کر آیا اور قالین پر دوزانوں بیٹھ کر پلنگ کے نیچے سے اون کا گولہ کھینچنے لگا۔ گولہ دیوار کے ساتھ لگا تھا اور بکس والے پلنگ کے نیچے وہ گھس نہ سکتا تھا۔ اور اس طرح کھینچتے کھینچتے اس نے لپٹا ہوا گولہ سالم کھول دیا۔

"ارے...... یہ کیا کیا تم نے"

"ابھی دیکھئے جی...... میں کیا گولہ بناتا ہوں۔" وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اون کا سرا لیکر لپیٹنے لگا۔ اس نے لمبے سے کُرتے کے ساتھ نیکر پہنی ہوئی تھی۔ جو شاید اس کے باپ کے پرانے پاجامے کے گھٹنے گھس جانے کے بعد کاٹ کر بنائی گئی تھی اور اتنی ڈھیلی تھی کہ اس کے زانو سے خاصی اوپر ہو گئی اور جس مقصد کے لیے اس نے نیکر پہنی تھی وہ فوت

ہوتا ہوا دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس کی سمجھ میں میری ہنسی کی وجہ نہ آئی تو وہ مسکراتے ہوئے حیران سی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اور اون کو جلدی جلدی لپیٹنے لگا۔ پھر اچانک اس نے سر جھکایا اور جلدی سے نیکر برابر کر کے میری ہنسی میں اپنی کھسیانی سی ہنسی ملا دی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گولہ لے کر سلائیوں میں پرو دیا اور ایک طرف رکھ دیا۔ میرے پیٹ کے اندر ایک چھوٹے سے وجود نے کروٹ لی۔ میں پلنگ پر لیٹ گئی تو کروٹیں اور تیز ہونے لگ گئیں۔

"باہر چلو گے...... بازار...... میرے ساتھ۔" میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہن جی......" وہ خوشی سے چہکتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ابھی آتا ہوں تیار ہو کر۔" وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور میں پلنگ سے نیچے اتری اور سلیپر پہن کر باہر آئی تو وہ بھی مجھے "تیار" ملا۔ اس نے منہ دھو لیا تھا اور بال گیلے کر کے ان میں ہاتھوں سے کنگا کر کے انگلیوں سے مانگ نکال لی تھی۔ اس کے ماتھے پر پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں اور کبھی پھسل کر ناک کی نوک پر رک جاتی تھیں۔

بازار میں وہ میرے ساتھ لگا لگا چل رہا تھا۔ بیچ بیچ میں سر اٹھا کر مجھے دیکھتا اور کبھی میرے پیٹ پر پھیلی ہوئی چوڑی سی سوتی اوڑھنی کو برابر کرتا۔ اور پھر مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے اس حرکت کی داد چاہتا ہو۔ میں ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا دیتی تو وہ ہنستا ہوا اوپر کے دانتوں سے نچلا ہونٹ دبا کر جھوم جھوم کر چلنے لگتا۔ کئی دکانوں سے ہم نے مختلف چیزیں لیں۔ اور جب پوشاک کی دکان سے وہ جینس اور جیکیٹ پہن کر نکلا تو اس نے میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود میرے ہاتھوں سے سارا سامان جو اس کے نصف وزن کے برابر تھا، اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں سنبھال لیا۔ موقعے کی نزاکت کو دیکھ کر میں نے جلدی سے گزرتے ہوئے رکشے کو روکا تو وہ روٹھی سی مسکراہٹ لئے مجھے دیکھنے لگا۔ اپنی بہادری پر میری یہ مہربانی اسے پسند نہیں آئی۔

"دور ہے نا۔" میں نے منانے کے سے انداز میں کہا۔

"زیادہ دور تو نہیں تھا جی...... میں لے جاتا آرام سے۔" وہ نیچے دیکھتا ہوا بولا۔

"جانتی ہوں تم ایک بہادر انسان ہو مگر میں بھی تو تھک جاتی نا چلتے چلتے۔"

وہ مسکرا دیا۔ میں جانتی تھی وہ اس اعزاز سے بہت خوش ہوگا۔

مگر جملے کا دوسرا حصہ سن کر اس نے سنجیدہ صورت بناتے ہوئے سر ہلایا۔

"او جی...... مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔"

پرلیں والے پالی نے کہا تھا کہ وہ سال بھر بعد جب گاؤں جائے گا تو اسے بھی گھما لائے گا۔ گھر والوں سے مل ملا کر پھر آ جائے گا اور دل لگا کر کام سیکھے گا۔ سال کیسے گزرا پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ کھیلتے کھیلتے، گاتے گنگناتے، فلم اداکاروں کی نقل کرتے کرتے کئی کام نبٹا لیتا۔ میری کسی اہم مصروفیت کے باعث کبھی جب وہ مسہری کے کنارے پر کھڑے ہو کر عاقب کی قمیض پر بٹن ٹانکتا تو مجھے اس پر بے تحاشا پیار آنے لگتا۔ عاقب بھی لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ لئے ادھر ادھر دیکھا کرتے۔ اگر مجھ سے روٹھے ہوئے بچے نہ منتے تو خدا جانے یہ ان کو کیسے کیسے منا لیتا۔ کبھی قلابازیاں کھا رہا ہے۔ کبھی بندر کی طرح ہاتھوں کو موڑے، ٹانگوں کو خم کیے چل رہا ہے کبھی ناچ رہا ہے کبھی گھوڑا بن رہا ہے۔ ہم بھی اس کی پسند کی ہر چیز اُسے دیتے اس کی ہر خواہش کا خیال رکھتے۔ خالی وقت میں میں اسے پڑھایا بھی کرتی۔

میرے بچوں نے پہلا لفظ جو بولنا سیکھا وہ "چھوٹو" تھا۔ سال بھر سے کچھ اوپر ہو گیا تھا۔ مگر وہ بچوں کو چھوڑ کر گاؤں جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کے بھائی کا بیاہ بھی ہونا تھا۔

"ماں یاد کرے ہے۔" پالی نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ چپ رہا۔

"گونا میں نا جئی ہو؟"

"نا جائیں...... بھیئن کو چھوڑ۔"

"توہار بھیئن نا ہی ادھر۔" پالی بولا تو وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور سر جھکائے گود میں لیٹے شہاب کے بال سنوارتا رہا۔ پھر اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھنے لگا۔ پھر پیروں کو۔ شاید اسے اس کا ننھا سا بھائی یاد آ گیا ہو گا۔ اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"اب تھوڑا بڑا ہو گیا ہو گا نا۔" اس نے مجھ سے کہا۔

اور کیا۔ ہو آؤ...... "میں نے سوالیہ سے انداز میں کہا۔

"اچھا جی...... "وہ مسکرا اُٹھا۔

وہ گیا تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ بہر حال پندرہ روز اس کی عدم موجودگی میں عجب خالی پن لئے ہوئے کٹے۔ عادی ہو گئی تھی میں اس کی سنگت

کی۔ عاقب بھی دو ایک بار اس کا ذکر کر چکے تھے۔ اور بچے بھی کبھی خوامخواہ رونا شروع کر دیتے۔ ایک روتا تو دوسرا بھی تان ملا دیتا۔

اس سے پہلے کہ میں گھبرا اُٹھتی وہ واپس آ گیا۔ سب کچھ نارمل ہو گیا۔ جیسے وہ کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ دو ایک دن کبھی ماں کا ذکر کرتا کبھی بھائیوں کی کوئی بات سنایا کرتا۔

''کہتے تھے لمبا ہو گیا ہوں...... گورا بھی...... ہو گیا ہوں نا؟''

''ماں کہتی تھی تمہیں سہر کا پانی لگ گیا۔''

''ٹھیک کہتے تھے۔'' میں نے پیار سے کہا۔

''مجھے اور لمبا ہونا ہے جی پھلمی (فلمی) ہیرو جیسا۔'' اس نے گردن تان کر کہا۔ اور ہنسنے لگا۔

گرمیوں میں مائکے گئی تو وہ بھی ساتھ آیا۔ اس نے پہلی بار کوئی پہاڑی علاقہ دیکھا تھا۔

''ہمارے ادھر کمل اتنے بڑے نہیں ہوتے جی...... یہ تو بہت سندر ہیں۔'' اس دن ہم جھیل کے کنارے پیر بابا کی درگاہ سے لوٹتے ہوئے شکارے میں بیٹھے تھے۔ تو وہ بولا تھا۔ اس نے کنول کے ایک پھول کی ڈنڈی پکڑی تو شکارے کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔

''بسم اللہ'' میں نے گھبراہٹ کے مارے جھٹ سے اس کا بازو تھام لیا۔

''گر جاتے ہیں ایسے...... ایسا نہیں کرنا چاہیے۔'' اس نے فوراً ڈنڈی چھوڑ دی اور میرے قریب ہو گیا۔ شکارے والے نے اس کی طرف دیکھ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''آرام سے بچے...... برتن اس طرح رکھ دو تا کہ کشتی کا توازن برقرار رہے۔......'' اس نے چھوٹو سے کہا۔

''یہ ترامی دھولوں جی......'' اس نے برتن دوسری طرف رکھتے ہوئے وہ ترامی ہاتھ میں لے لی جس میں حلوا بنا کر ہم درگاہ پر بانٹنے کے لئے لے گئے تھے۔

''نہیں بیٹا...... گھر میں دھولیں گے...... وہ دیکھو۔''

دوسری طرف سے نسواری، سفید، کالے، سیاہی، مائل نیلے اور سبزی مائل سیاہ پروں والی بطخوں کا جھنڈ تیرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

جیسے بطخیں پانی پر ٹھہر گئی ہوں اور پانی خود بخود انہیں ان کی مرضی کے مطابق بہائے جا رہا ہو...... پھر کبھی اچانک کوئی بطخ اس سکون اور خاموشی کو کیں کیں کر کے توڑتی اور کسی

تیرتی ہوئی چھوٹی سی جاندار شے کو پانی میں سے دبوچ لینے کے لئے اپنی چونچ سر اور آدھا دھڑ کچھ اس طرح پانی میں ڈال دیتی کہ صرف اس کی دم والا حصہ ہی سطح کے اوپر رہتا۔ یہ بطخیں کشتی خانوں (House boats) کے مالکوں اور بجروں میں رہنے والے خاندانوں کی پالتو بطخیں تھیں۔

چھوٹو اس منظر میں ایسا محو ہوا کہ پلک جھپکنا بھول گیا۔ دوسری طرف نیلے نیلے پانی پر نیلے نیلے آسمان تلے لمبی تمکین گردنوں والے بہت سے سفید براق راج ہنس شاہانہ چال سے تیرتے ہوئے دور دور تک پھیلے ہوئے پانی پر جانے کہاں جا رہے تھے۔ فیروزی اور عنابی پروں اور لمبی نوکیلی چونچ والا ایک نیل کنٹھ ہمارے شکارے کے دوسرے سرے پر بیٹھا اپنی زمردی آنکھوں سے شفاف پانی کا ایکسرے کرتا اور سطح کے قریب تیرتی ہوئی کسی روپہلی مچھلی کو آناً فاناً دبوچ کر کبھی کہیں جا بیٹھتا کبھی کہیں۔ شکارا جوں جوں کنارے سے دور ہوتا جا رہا تھا جھیل اتنی ہی شفاف اور حسین نظر آنے لگی تھی۔ عجیب روح پرور سی ہوا شکارے کے عمدہ خوش رنگ پردوں کو ہلکورے دے رہی تھی۔

"یہ مچھلیوں کو ڈال دوں جی۔" چھوٹو نے ترامی سے چپکے حلوے کے زروں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے کہا۔

"اچھا...... ڈال دو۔" میں نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔ وہ غور سے پانی کے اندر دیکھتا ہوا جھیل کی تہہ میں سے اُگ کر پانی کی سطح تک آنے والی لمبی لمبی ہری ہری گھاس میں تیرتی پھرتی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کے قریب حلوہ پھینکتا اور کبھی کسی مچھلی کو چھونے کی کوشش کرتا۔ ایسی ہی ایک کوشش میں جب اس نے ایک ہاتھ سے ایک ننھی سی مچھلی پکڑنا چاہی تو شکارے کے چوبی کنارے پر آدھی ٹکی ہوئی، چکنی ترامی اس کے دوسرے ہاتھ کی گرفت کا کوئی لحاظ نہ کرتے ہوئے پانی میں جا گری۔

"آنٹی جی...... " وہ چیخا اور جھک کر تانبے کے اس بھاری اور بڑے تھال کو پانی کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میرے مضبوطی سے پکڑنے کے باوجود اس نے ترامی کو تھام لینے کی کوشش میں شانے تک اپنی آستین بھگو دی۔ تہہ میں اُگے سبزے کے گہرے گہرے سایوں میں جب ترامی غائب ہو گئی تو وہ متحیر سا میری طرف مڑا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں تلے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ترامی کے کھو جانے کے ڈر سے یا اسے ڈوبتا دیکھنے سے، یہ میں

سمجھ نہیں پائی۔ مگر میرا اس کا رشتہ ڈر اور فرض کا نہیں تھا۔

"کوئی بات نہیں ...... اچھا...... ؟" میں نے اس کی ٹھڈی ہلا کر کہا۔ شکارے والا چپو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور شکارے کے اندر سے لمبا سا بانس کھینچ کر پانی میں ادھر ادھر چلا کر ترامی کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ملے گا نہیں شاید...... نظر آ بھی گیا برتن تو باہر نہیں لا سکتے" وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"میں اب اتنا گہرا غوطہ تو نہیں لگا سکتا۔ مگر جگہ یاد رکھوں گا کسی سے نکلوا لوں گا...... آپ پتہ بتا جانا...... اب ہانڈی کٹورا ہوتا تو ابھی اِسی ہم تل سے نکال لیتا۔" اس نے بانس نما ڈنڈے کی طرف اشارہ کیا جو اصل میں بانس نہیں ہوتا بلکہ سفیدے کے لمبے پتلے کم عمر درخت کو چھیل کر اس چوب دراز سے کشتی کھینے کا کام لیا جاتا ہے۔

"نہیں بھیا شکریہ اتنی لمبی گھاس میں ہاتھ پاؤں پھنسنے کا خطرہ ہے...... چھوڑو۔ کوئی بات نہیں۔" میں نے شکارے والے کو ممنونیت سے جواب دیا۔

"یہ آپ ہی کا بیٹا ہے؟" کشتی بان نے سانولے سلونے چھوٹو کو بغور دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں یہ میرا بیٹا ہے۔"

"یہ آپ پر نہیں گیا...... اور بھی بچے ہوں گے آپ کے...... وہ بھی آپ جیسے۔"

"ہاں...... دو اور بھی ہیں۔ چھوٹے ہیں...... گھر پر چھوڑ آئی ہوں۔ شکارا پار کرنا تھا نا...... تو...... یہ تو سمجھدار ہے۔ پھر سامان بھی تھا۔" میں نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کرتے ہوئے چھوٹو کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا وہ میری آنکھوں میں ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ کھیل گئی اور چہرے کا رنگ رفتہ رفتہ واپس آ گیا۔

ہم واپس اس شہر میں آ گئے تو ملنے والوں نے کہا کہ بچے تر و تازہ لگ رہے ہیں اور چھوٹو بھی تازہ دم ہو کر آیا ہے یہ سن کر وہ بہت خوش ہوتا۔ ایک دم سے اُس کا قد بھی نکل آیا تھا۔ دونوں بچوں کو کہنیوں سے ذرا اوپر بازو پکڑ کر وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر سر پر باندھ لیتا اور دھیرے دھیرے گھومتا۔ اور بچے جیسے گھومنے والے جھولے سے لٹکے۔ قہقہے لگاتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے رنگ برنگی تتلیاں پیروں میں پازیبیں باندھے باغیچے میں اتر آئی ہوں۔

"اب یہ پریس اٹھا لے گا بی بی جی...... "ایک دن پالی کپڑے دینے آیا تو چھوٹو کو دیکھتے

ہوئے بولا۔

"چلو ہو......؟"

"باجار (بازار) کے لئے نکلوں گا...... تو آؤنگا...... اگر پریس اٹھا سکوں تو ٹھیک...... ہے نا۔" چھوٹو نے جلدی سے کہا اور میں جانے کیا سوچنے لگی۔

دودھ لے کر جب وہ لوٹا تو ہنس رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں دودھ کی ڈولچی دوسرے ہاتھ سے شاداب کو اٹھائے ہوئے۔

"بڑا مزا آیا آنٹی جی......" اس نے دودھ نیچے رکھ دیا اور شاداب کو گردن پر بٹھا کر اس کے دونوں ٹخنوں کو پکڑ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔

"دڈو بولے پریس کر...... میں نے پریس اٹھائی ذرا سی پھرائی اور باجو (بازو) پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بہت بھاری ہے دڈو مر جاؤں گا...... اور بے چارے ددو سچ سمجھ گئے بولے جا...... ابھی تیرے دن نہیں ہیں پریس کرنے کے۔ اتنا مجور تھوڑو ہوں جی...... ددو تو بدھو بن گئے۔" وہ ہنس ہنس کر بتانے لگا اور اس کے کاندھوں پر چڑھا شاداب اس کا ماتھا پکڑے کچھ نہ سمجھ کر بھی قہقہے لگا رہا تھا۔ شہاب بھی جانے کب بیدار ہو گیا تھا اور چھوٹو کی ٹانگ پکڑ کر کندھے پر چڑھنے کے لئے مچل رہا تھا۔ ان دونوں کو ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنسنے لگا۔

"ایسے نہیں کہتے...... تمہارا اچھا ہے۔"

"کیا کروں جی، مجھے استری کرنے کا کام اچھا نہیں لگتا۔ اس نے شاداب کو میری باہوں میں تھما کر شہاب کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس سال وہ گھر بھی نہیں گیا۔ اگلی گرمیوں میں جب ہم پھر پہاڑ پر گئے تو میرے ساتھ ساتھ میرے رشتہ داروں نے اس کا بھی کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ آس پاس بازار جان گیا تھا۔ کچھ منگوانا ہوتا تو ہر ایک اسی کو آواز لگاتا۔

ایک دن اپنا گھٹنا اور شاداب کا ماتھا چھلا ہوا لئے چلا آیا۔ میں نے لنگڑاتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا چھوٹو۔"

"کیا بتاؤں آنٹی جی...... بھگوان نے بچا لیا۔ رحمان کی دکان سے بریڈ لے کر پلٹا تو خیال ہی نہیں رہا کہ دکان کے چھجے کے نیچے کتا لیٹا ہوا ہے۔ میرا پاؤں اس کے پنجے پر پڑا تو وہ زور

سے بھونک کر اچھلا۔ میں گھبرا کر گر پڑا۔ بوا کندھے پر تھا۔ وہ بھی گرا تو میں نے بازو آگے کر دیا اور وہ مٹی پر گر گیا ورنہ آگے بڑا سا پتھر دیکھ کر میں نے من ہی من میں بھگوان کا نام لیا۔ پھر اسی وقت یاد آیا کہ ایسے میں 'بسم اللہ' کہتی ہیں آپ۔ میں نے بھی کہا۔ دو بار نام لیا اس کا۔ اسی لئے ہم دونوں ہی بچ گئے جی آج تو...... میں نے زور سے بسم اللہ کہا تو عبدالرحمان نے مجھے شاباشی دی۔"

وہ کالی کالی شفاف آنکھیں پھیلائے پاک صاف سی باتیں کرتا رہا اور مجھے اس پر پیار آتا رہا۔

"چلو اچھا ہوا...... خدا کا شکر ہے...... دکھاؤ ذرا گھٹنا۔" میری آواز بھاری سی ہو گئی تھی میں نے شاداب کو گود میں لیا اور چھوٹو کے گھٹنے کے زخم کو دیکھنے لگی۔

اس بار گرمیاں جیسے جلدی جلدی گزرتی معلوم ہو رہی تھیں۔ ہم سہ پہروں میں اکثر بچوں کو لیکر سیر کو نکل آتے۔ کسی طویل سڑک کی طرف، کسی پھلوں بھرے باغ میں یا پھر پانیوں کے کنارے......

میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہرے شنیل کی چادر جیسی گھاس پر بیٹھی ہوں اور سامنے چھوٹو، شہاب اور شاداب نوزائدہ بلوٹوں کی طرح ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ غور سے دیکھتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ چھوٹو کی مٹھی میں کچھ ہے اور یہ دونوں اس کے اوپر سوار 'وہ شئے' حاصل کرنے کے درپے ہیں تینوں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔ پھر چھوٹو اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دوڑنے کے انداز میں سست رفتاری سے چلتا ہوا کئی رنگوں کے گلابوں کے پودوں سے لدی کیاریوں کے بیچوں بیچ گول مول ہو کر بیٹھ جاتا اور یہ دونوں اس کا نام پکارتے اسے تلاش کرتے۔

جو پہلے پہنچتا وہ مٹھی کھلوا لیتا اور اس میں سے پھول حاصل کر کے خوشی سے اچھلتا کودتا دوسرے کو دکھاتا تو وہ منہ بسور کر ناراض ناراض سا کبھی پھول کو کبھی چھوٹو کو کبھی مجھے دیکھتا تو چھوٹو ہاہاہا کہتا ہوا ہوا میں مکا لہراتا اور چھو کہہ کر جیسے جادو کے زور پر خلا میں سے پھول حاصل کر کے دوسرے کے ہاتھوں میں تھما دیتا۔ ان دونوں ننھے منے مکھڑوں کے درمیان تصویروں میں اس کا معصوم چہرہ کسی سیاہ گلاب کے پھول کی طرح لگتا ہے۔

"بس بس مائی مارے گا۔" وہ چاروں ہاتھوں پیروں پر دوڑ رہا ہے اور بچے اس کے پیچھے

پیچھے۔ پھول راستے میں ہی کہیں گر گئے ہیں ان کے ہاتھوں سے۔ مگر میں نے اٹھا لئے ہیں۔

ان دنوں ایک اور بات بھی ہوئی تھی۔ جس سے میرے اندر عجیب طرح کا ڈر سرائیت کر گیا تھا۔ اب بھی کبھی یاد آتا ہے تو کانپ اُٹھتی ہوں۔

اس دن چھوٹو بازار سے لوٹا تھا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی ''آنٹی جی ... میرے کو کچھ دن کی چھٹی چاہیے۔ آپ دیں گی؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''چھٹی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''کہاں جانا ہے...... واپس گھر تو جائیں۔''

''وہاں نہیں جی...... یہاں چاہئے...... پھر کچھ دن میں میں آجاؤں گا۔''

''کیا...... کہہ کیا رہے ہو تم؟'' میں نے مزید حیرت سے دریافت کیا۔

''وہ سیکرٹ ہے جی...... آپ پرومز کریں کہ آپ کسی کو نہیں بتائیں گی۔''

''نہیں بتاؤں گی......''

''عبدالرحمٰن کہتا تھا...... آنٹی جی آپ کو پتہ ہے......؟'' وہ کچھ بے ترتیب جملے کہہ کر کچھ دیر کو رُکا...... پھر ادھر اُدھر دیکھ کر دھیرے سے بولا...... ''اس کے پاس گن ہے...... اتنا چھوٹا سا...... وہ کہتا تھا کہ اگر میں بھی اس کی طرح بہادر بنوں گا تو وہ مجھے بہت سے پیسے اور ایسا ہی گن دے گا...... بس کچھ دن جانا پڑیگا باہر پھر میں بھی امیتابھ بچن کی طرح...... ڈشکو...... ڈشکو گولی چلاؤں گا۔''

''کس پر......؟'' میں ہکا بکا رہ گئی۔

''دشمن پر جی اور کس پر۔ عبدالرحمٰن بولتا تھا۔''

یہ سب سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے ہفتہ بھر بعد جانے والے ٹکٹ کینسل کروا کر دوسرے ہی دن کی بکنگ کروالی۔

گھر پہنچ کر چین کا سانس لیا۔

اگلے برس میں وہاں نہیں گئی۔ اس سے اگلے بھی نہیں۔ کچھ اور وقت بیت گیا۔ چھوٹو کی صحت اچھی ہو گئی۔ وہ پہلے سے خاصا چالاک بھی ہو گیا تھا۔ ہمارا کوئی اپنا سا تھا وہ۔ گھر کا اہم فرد تھا۔ بچے بھی تھوڑے اور بڑے ہو گئے تھے۔ اب آپس میں بھی کھیلا کرتے تھے۔ چھوٹو خالی وقت میں کبھی باہر گھوم آتا کبھی اپنی پسند کی کوئی چیز پکانے کی کوشش کرتا۔

اچانک میں محسوس کرنے لگی کہ چھوٹو بازار میں زیادہ ہی وقت لگانے لگا ہے۔ معلوم

ہوا کہ بنئے کی دکان پر کام کرنے والا کوئی لڑکا اس کا دوست بن گیا ہے۔اور آس پاس کے کچھ گھریلو ملازمین بھی جن میں ایک دو چھوٹو کے ہم عمر تھے اُس سے ملا کرتے تھے دکان کے سامنے پارک تھا جہاں ان سب کی محفل جما کرتی۔

اس کا اپنے ہم عمروں کے درمیان دل بہلتا ہوگا۔ میں سوچا کرتی......

مگر اِدھر کچھ دِن سے گھر میں اس کا دل لگتا ہی نہ تھا۔ بچوں سے بھی کھچا کھچا سا رہتا۔ جیسے کسی اور کام کی جلدی ہو اسے۔ ایک دن جب کچھ زیادہ ہی دیر دکان سے نہیں لوٹا تو میں خود دیکھنے گئی۔

دیکھا پارک سے باہر نکل رہا تھا۔ دودھ کی ڈولچی ہاتھ میں ایسے لہرا رہی تھی کہ صاف پتہ چلتا تھا کہ خالی ہے۔ دور سے مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے ہاتھ اپنے پیچھے چھپالئے مگر میں نے اس کے نتھنوں سے دُھواں نکلتا ہوا دیکھ لیا تھا۔

"کیا ہُوا دودھ نہیں لائے......؟" وہ قریب پہنچا تو میں نے آواز کا غصہ اور حیرت قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

"وُہ جی......پیسے گم ہو گئے تھے۔" وہ زمین کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"تو پھر اِدھر پارک میں کیا کر رہے تھے۔"

"وہاں تک گیا تھا پہلے......وہ......راجو ملا تھا......میں نے سوچا کہیں وہیں پر نہ گر گئے ہوں۔" وہ سر جھکائے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا۔

خدا جانے سچ کیا تھا...... مگر اسے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ میں صرف یہ ہی سوچ رہی تھی کہ کس طرح اسے سمجھاؤں......

میں نے اسے دودھ کے لئے مزید پیسے دیئے اور گھر آگئی۔ میرے پیچھے ہی وہ بھی دودھ لے کر پہنچ گیا۔ چپ چاپ سا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا چھوٹو......" میں نے اپنی آواز میں دُکھ کے تاثر کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"کیا جی......میں نے......کچھ نہیں......میں نے......" وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ شکر ہے کہ اسے جھوٹ بولنے میں شرم آتی تھی۔

"جانتے ہو یہ بہت بری چیز ہے۔ پھیپھڑے تباہ کر دیتی ہے......

بڑی بری بیماریاں لگتی ہیں دھویں سے...... یہ تمہارے دوست پلاتے ہیں نا تمہیں...... یہ دشمنی کرتے ہیں بیٹا...... ان سے ملنا چھوڑ دو...... پھر سے کبھی مت پینا ایسی کوئی چیز......"

مجھے یقین تھا کہ وہ سنبھل جائے گا۔ میری بات نہیں ٹالے گا۔ مجھ سے معافی مانگ کر وعدہ کرے گا کہ اس نے غلطی سے ایسے ہی چکھنے کے لئے ایک آدھ کش لے لیا تھا اور اب ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ مگر وہ میری بات چپ چاپ سنتا رہا۔ سر جھکائے شرمسار سا خجل سا۔ بولا کچھ نہیں...... خیر اندر سے تو اس نے یہ سوچ ہی لیا ہوگا...... مارے ندامت کے کچھ بول نہیں پا رہا ہوگا۔ میں سوچنے لگی تھی۔ اچانک اس طرح چوری پکڑے جانے پر اس کا سٹپٹا جانا لازم تھا۔ تھوڑی دیر میں خود ہی آئے گا میرے پاس۔ مگر رات ہو گئی تھی۔ اس نے کچھ نہ کہا، نہ کسی سے بولا۔ بے چین سا رہا۔ کچھ ٹھیک سے کھایا بھی نہیں...... وہ سچ مچ شرمندہ تھا۔

دوسری صبح اس بارے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ بس میرے اور عاقب کے چہروں کو ایک آدھ بار غور سے دیکھ لیتا۔

ہو سکتا ہے وہ یہ سوچتا ہو کہ میں نے عاقب سے یہ بات کہیں کہہ تو نہیں دی...... میں نے واقعی یہ بات ان سے نہیں کہی تھی کہ مجھے یقین تھا چھوٹو اب ایسا نہیں کرے گا۔ اور سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔ اسے چپ چپ سا مرجھایا مرجھایا سا دیکھ کر میں اداس سی ہو جاتی تھی۔

مگر کچھ بھی نارمل نہ ہوا...... چھوٹو اب باہر اور بھی زیادہ وقت لگانے لگا تھا...... کئی دفعہ اس نے جھوٹ بھی بولا تھا...... اور اب اکثر ہی اس کے پیسے گم ہو جایا کرتے...... پھر وہ خود بجھا بجھا سا بھی رہنے لگا تھا۔ میں پوچھتی تو کچھ تسلی بخش جواب نہ ملتا۔ پھر اس کی صحت بھی گر رہی تھی۔ مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ نظر ملا کر وہ بات بھی نہیں کرتا تھا۔ سودا سلف لانے میں واضح بے ایمانی کرنے لگا تھا۔ اس کا ہنسنا کھیلنا بھی جیسے چھوٹ گیا تھا۔

"اتنے خاموش کیوں ہوا کرتے ہو آجکل تم؟" ایک دن میں نے اسے گھر میں تلاش کرنے کے بعد ایک کونے میں دبکا دیکھ کر پوچھا۔

"گھر کی یاد آرہی ہے کیا؟" مجھے دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"نہیں جی......" وہ سر جھکائے بولا اور ناک پونچھنے لگا۔

"پھر کیا بات ہے...... یہاں خوش نہیں ہو کیا...... صاحب نے کچھ کہہ دیا؟"

"جی نہیں جی...... میں تو ٹھیک ہوں۔"

"مجھ سے بھی چھپاتے ہو...... اپنی آنٹی سے...... اپنی ماں سے۔" میں نے انگلی سے اس کی تھوڑی اوپر کر کے کہا...... اس کی آنکھوں سے ناک سے پانی برس رہا تھا۔

"ارے کیا ہوا...... رو رہے ہو کیا؟" میری بات سننے سے پہلے ہی وہ پیٹ پکڑ کر کراہنے لگا۔ اور بُری طرح ہاتھ پاؤں مار کر تڑپنے لگا۔

"چھوٹو...... چھوٹو کیا ہوا...... کیا ہوا بیٹا......"

بات میری سمجھ میں آئی تو ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ فوراً عاقب کو دکان پر فون کیا۔ غصے اور دُکھ کی اٹھتی ہوئی لہر کو میں نے اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر دبالیا۔

ان پھڑ پھڑاتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے میری ممتا کے آنچل کے کئی تار سنوارے تھے۔ میں چھوٹو کو ضائع نہیں ہونے دونگی۔ میں کسی قیمت پر بھی کوئی رسک (Risk) لینے کو تیار نہیں تھی۔ اس حال میں میں اسے الگ نہیں چھوڑونگی۔

کچھ پس و پیش کے بعد عاقب نے بھی میرا ساتھ دیا۔

کئی دن ڈی اڈیکشن سینٹر (DeaddictionCentre) میں رہنے کے بعد چھوٹو نارمل ہو گیا۔ ایک بار پھر خدا نے اسے بربادیوں کے پنجے سے بچا کر میری پناہ میں دے دیا اور زندگی گزرنے لگی۔

میں نے اسے بہت سی باتیں بتائیں۔ کہ اس کی جاتی ہوئی معصومیت کو لڑکپن کی آگہی اور جوانی کی متانت کی ذمہ داری لینے کے قابل ہونا تھا۔ وہ بھی ہر بات سمجھ رہا تھا۔ اور مطمئن تھا کہ اس کی زندگی بُری عادتوں کی قید سے آزاد ہو گئی۔

دو تین برس اور بیت گئے چھوٹو سال میں ایک دفعہ گھر کا چکر لگاتا۔ اس کا چھوٹا بھائی سکول جانے لگا تھا میرے دونوں بچے بھی سکول جا رہے تھے۔ چھوٹو اب عاقب کی غیر موجودگی میں بھی بخوبی دکان سنبھالتا۔

ایک دن میں کھانا لگانے والی تھی کہ وہ دکان سے آتے ہی اپنے کمرے کی طرف گیا۔

"آنٹی جی کھانا نہیں کھاؤں گا...... پیٹ دکھ رہا ہے۔" اس نے آواز لگا کر کہا۔

"باہر کوئی خراب چیز کھائی ہوگی۔ آؤ تھوڑا سا کھالو" مگر اس نے شاید میری بات نہ سنی۔

کچھ دیر بعد میں اس کے کمرے کی طرف گئی تو...... وہ زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے بستر درست کیا تو بدبو کا بھبھکا میرے نتھوں سے ٹکرایا۔ میں سُن ہو کر رہ گئی۔ جی چاہا

دو تھپڑ رسید کروں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفعہ کردوں اسے کہیں دور، جہاں سے مجھے اس کی فکر نہ ستائے۔ کچھ بچوں میں کیوں بُری چیز کی طرف کھچے چلے جانے کا رجحان اتنا زیادہ ہوتا ہے۔

جانے کیا کیا بڑبڑاتی ہوئی میں کمرے سے باہر نکل آئی۔

مارے پریشانی کے میرا براحال ہو گیا۔ عاقب نے سنا تو غصے سے لال پیلے ہو گئے۔

"نکال باہر کیجئے بد بخت کو۔ کوئی اچھی چیز اپنا تا ہی نہیں۔ سر چڑھایا ہے اسے آپ نے۔"

"ہماری اولاد کی طرح ہے...... "بھولی بھالی آنکھوں والا معصوم سا مکھ میرے تصور میں گھوم گیا...... چھوٹے چھوٹے ہاتھ میرے پیٹ پر چادر درست کرنے لگے۔

"اب ویسے بھی وہ خود ہی چلا جائے گا جب اسے معلوم ہو گا کہ ہم جان چکے ہیں...... مجھے بھی شک ہوتا تھا کہ کیا بات ہے جو رات کو اتنے گھنٹے سو کر بھی یہ دن بھر دکان پر اُونگھنے لگ جاتا ہے۔" وہ ناگواری سے بولے۔

"ہمارے سونے کے بعد ٹہلنے جو جاتا تھا...... دیر میں سوتا ہو گا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ٹہلنے نہیں پینے جاتا تھا کم بخت۔"

عاقب سو گئے تو میں چھوٹو کے کمرے میں گئی۔ اس کے کمرے کے ساتھ ہی اسٹور کا مختصر سا حصہ بھی تھا۔

کولڈ ڈرنک کی خالی بوتلوں کے درمیان شراب کی بھی کئی خالی بوتلیں تھیں۔ میں نے ایک ایسی بوتل کو پیر سے سرکایا تو وہ زوردار خراٹوں کے درمیان اونچی آواز میں کراہا۔

اف...... جانے کب سے...... ضرور پڑوس کے بنسی سے سیکھا ہو گا اس نے۔ دوست بھی تو ہے اس کا...... میں قیاس آرائیاں کرنے لگی۔

بنسی جب مہر سنگھ جی کے لئے ڈرنک (Drink) بناتا ہے تو اپنے لئے بھی چپکے سے ایک آدھ جام تیار کر لیتا ہے۔ سنگھ صاحب نے عاقب کو خود بتایا تھا۔ بنسی بھی اندر سے جانتا ہے کہ صاحب اس کے پینے کے بارے میں جانتے ہیں...... بس ایک بھرم سا...... بہر حال...... بنسی تو ادھیڑ عمر کا آدمی ہے...... رنڈوا...... کوئی آگے نہ پیچھے۔ مگر اس بیوقوف کی عمر ہی کیا ہے۔

غصے کی ایک لہر میرے پورے وجود میں سرائیت کر گئی۔ میں نے اس کی ٹانگ پر ایک زور کی ٹھوکر ماری۔

مگر وہ خدا کا بندہ بے خبر سوتا رہا۔ میں کئی لمحے اسے دیکھتی رہی۔ جانے کیوں......
نہیں...... میں جانتی تھی کیوں......

پھر جب میں سونے چلی گئی تو مجھے اس کے اُبکائی لینے کی آوازیں آنے لگیں۔ پریشانی سے رات بھر سو نہ سکی میں۔

اب کیا ہوگا...... عاقب اگر اسے گھر روانہ کردیں گے تو پکا شرابی بن جائے گا...... شاید بن بھی چکا ہو...... مگر وہاں اس کا کیا ہوگا۔ کہیں اور کام وام کر کے پیئے گا...... نہیں میں ایسا نہیں ہونے دونگی۔

ایک بار پھر میں نے عاقب کو منا کر چھوٹو کو ڈی ایڈیکشن (Deaddiction) میں بھرتی کروادیا۔

"میں یہ سب نہیں کرنا چاہتا تھا...... پتہ نہیں کیا ہوگیا۔ مجھے معافی دے دیں آنٹی جی...... میں خراب ہو گیا ہوں......" سینٹر جانے کے دن وہ میرے پیر پکڑ کر رو رہا تھا...... میں نے اس دن سے اس کے ساتھ بات نہیں کی تھی۔ مگر سینٹر میں میں اسے دیکھنے برابر جاتی رہی۔

"اب میں ٹھیک ہو جاؤں گا...... کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ کوئی غلط کام نہیں کروں گا...... آپ کا من نہیں دکھاؤں گا۔"

مگر میرا دِل جانے کیوں بے چین تھا۔ مجھے آج اس کی کوئی بات سچی یا اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں بچوں کو ایک دن بھی وہاں لے کر نہیں گئی۔

کچھ وقت بعد وہ گھر آگیا۔ اس چھوٹی سی عمر میں جیسے اس نے ساری زندگی جی لی تھی۔ زیادہ تر خاموش رہتا۔ عاقب نے اسے دکان چلنے کے لئے نہیں کہا۔ گھر میں کبھی کوئی چیز پکا لیتا۔ کبھی کوئی چیز جھاڑ پونچھ لیتا۔ یوں ہی بیکار بیکار سا نظر آتا۔

اس دن میں نے عاقب سے گھنٹہ بھر اس کے بارے میں بات کی تھی۔

اس کا دکان جانا شروع ہو گیا۔

اب وہ جلدی آجاتا تھا۔ عاقب کے ساتھ...... میں اس کا کمرہ وقتاً فوقتاً چیک کرتی...... سب ٹھیک ٹھاک تھا۔

میں اب اس کی طرف سے مطمئن ہو گئی تھی۔

اچانک ایک دن عاقب نے بتایا کہ چھوٹو پھر پینے لگا ہے۔ میرے پیروں سے زمین

کھسک گئی۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں تو اس کے لئے کچھ نئے منصوبے بنا رہی تھی.....
یہ کیا ہو گیا۔

عاقب کو جب معلوم ہوا تھا تو اس نے اسے تھپڑ بھی مارا تھا۔

کبھی کبھی جب پڑوس میں دیر تک بتی جلتی نظر آتی تو یہ بنسی سے ملنے چلا جاتا۔ دواؤں کی وجہ سے اسے شراب کی بو سے ہی الجھن ہونے لگی تھی..... مگر بنسی کو پیتا دیکھ کر.....

پہلے صرف بوتل کو سونگھا کرتا..... پھر کئی دن بعد جب اسے بو، ناگوار نہ محسوس ہوئی تو اس نے ایک دن بوتل کا ایک ڈھکن پیا۔ دوسرے دن دو اور..... پھر سلسلہ چل نکلا.....

بنسی نے عاقب کو بتایا تھا.....

میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ میری نظروں کے سامنے کبھی چھوٹو کا وہ پہلا والا معصوم سراپا پھر جاتا ہے، کبھی عبدالرحمٰن ڈکاندار کا شفاک سا چہرہ۔ اور کبھی بنسی کی عیار نظریں۔ میں کس کس پھول کو کون سی آندھی سے بچا کے رکھ سکتی ہوں۔

میں اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

□□

(''نیا سفر'' الہ آباد، ۱۹۹۹ء)

اماں

آج پھر میں سارہ سے باتیں کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی کہ اس نے حسب معمول مجھے جلدی سے سلام کیا اور واپس جانے کے لیے مڑی۔ مجھے حیرت میں ڈال کر اس کے قدم گھر جانے والے راستے پر پڑ چکے تھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب کاشت کاروں کو اپنے حقوق کا کچھ کچھ احساس ہونے لگا تھا۔ مگر ابھی بھی کئی دیہات ایسے تھے جہاں کے لوگ جاگیرداروں کو آقا و حاکم سمجھے ہوئے تھے۔ ان میں یہ گاؤں بھی آتا تھا۔ مختلف گاؤں میں پرائمری اسکول کھلنے شروع ہو گئے تھے۔ مگر لوگ تعلیم کی افادیت سمجھنے سے محروم تھے، پھر بھی استادوں کی تقرریاں بہت تیزی سے ہو رہی تھیں۔ جہاں کسی نے سات آٹھ جماعتیں پاس کیں، استاد ہو گئے۔ انہیں دنوں میں نے ساتویں کلاس کا امتحان دیا تھا اور کچھ دنوں تفریح کی غرض سے گاؤں چلی آئی تھی۔ کوئی مہینہ بھر پہلے میری بڑی آپا کی ایک پرائمری اسکول میں سنگل ٹیچر کی حیثیت سے تقرری ہوئی تھی۔ اسکول کیا تھا، اپنی ہی حویلی کے پچھواڑے، مہمان خانے کی نچلی منزل کا کونے والا ہال۔ ایک بورڈ پر گورنمنٹ پرائمری اسکول لکھوایا گیا جسے مہمان خانے کی زیریں منزل کے مشرقی دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

آپا سارا دن اپنا کام کیا کرتیں اور کبھی شوقیہ باغیچے میں کرسی بچھا کر اون کا گولہ اور سلائیاں لے کر بیٹھ جاتیں جیسے کہ انہوں نے اپنی استانیوں کو خالی وقت میں بنائی کرتے کبھی دیکھا تھا۔ مگر یہ خالی وقت بھی خالی رہتا چلا گیا۔ آپا کچھ دنوں تک اسکول کے بورڈ پر نئی تاریخیں لکھتیں۔ رجسٹر کھول کر طلبا کی منتظر رہتیں۔ مگر بعد میں کئی ہفتے انہوں نے کمرہ ہی نہ کھولا۔ ان ہی دنوں پتہ چلا کہ اسکول انسپکٹر صاحب اسکولوں کے دورے پر ہیں۔

دادا جان کی مداخلت سے گاؤں والوں میں سے کچھ نے احتراماً اپنے بچے اسکول بھیج دیے۔ نہ وردی، نہ کتابیں، ناک بہتی ہوئی، ناخن میلے ناتراشیدہ، بال الجھے ہوئے۔

خیر رجسٹر پر کرنے کے لیے کچھ بچے مل گئے، نام لکھے گئے، تاریخ پیدائش، ولدیت وغیرہ...... دوسرے دن دو ایک بچے آئے۔ تیسرے دن صرف ایک...... میں بچوں کو گھروں کے آس پاس سے پھسلا کر لے آتی۔ کئی دن میں اور آپا ایسا ہی کرتے رہے مگر بات بنی نہیں۔ سوائے ایک بچے کے کوئی بچہ اسکول نہ آتا۔ البتہ جس دن انسپکٹرس صاحبہ آئیں ہم نے بچوں کو ٹافیاں دے کر کلاسوں میں بٹھائے رکھا۔ چند جملے رٹائے، الف سے اللہ ب سے بطخ وغیرہ وغیرہ، دس تک گنتی، دو کا پہاڑا۔ انسپکٹرس صاحبہ نے بھی کسی بچے سے نہ پوچھا کہ وہ کون سی کلاس میں ہے۔ صرف نام پوچھا۔ اور پھر آپا سے کچھ سوال۔ کورس یا نصاب کے بارے میں نہیں۔ بس یہی کہ کیسا لگ رہا ہے وغیرہ قسم کے...... یوں بھی اس طرح کے اسکولوں کو ایک ٹیچر مینج (Manage) کر لیتا تھا کہ ایک کلاس میں ایک آدھ طالب علم ہوتا۔ جب تعداد بڑھ جاتی تو دوسرا استاد رکھا جاتا۔ انسپکٹرس صاحبہ چائے نوش فرما کر، آپا کی تعریف کرتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

بعد میں دادا جان نے اخروٹوں کی گریوں کی کچھ تھیلیاں ان کے دولت خانے پر بھجوا دیں۔

ان کے روانہ ہوتے ہی تمام بچے رخصت ہونے لگے تو میں نے چاک کے نئے ڈبے کو کھولا اور بچوں کے ساتھ مل کر بورڈ پر کچھ الٹی سیدھی لکیریں، کچھ طوطے، کچھ چہرے بنانے کی کوشش کی، کچھ دیر بعد بچے چلے گئے۔ بس صرف ایک بچہ اور میں رہ گئے۔

کیا سادہ زندگی تھی ان بچوں کی بھی۔ نہ پڑھنے کی فکر نہ فیل ہونے کا خوف، نہ اپنا غم نہ والدین کی ڈانٹ کا ڈر...... سارا سارا دن بید کی ٹہنیوں سے بنی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں پہلوؤں سے لگائے لمبے لمبے چغے سے پہنے گھاس کے میدانوں میں سے بوٹی نما سبزیاں چنتے۔ ندی کے چکنے پتھروں کی اوٹ میں چھپی نہایت ننھی ننھی مچھلیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے۔ ہنستے، کھیلتے، کبھی کتوں کو ڈراتے کبھی بندروں کی نقل اتارتے...... کھیتوں اور جنگلوں کی سوندھی سوندھی مہک بھری تازہ سانسیں لیتے، سرخ سرخ ناک کو الٹے ہاتھ سے پونچھتے ہوئے گھروں کو جب جی چاہا چل دیتے اور راستے میں ہمارے اخروٹوں کے باغوں میں ہوا

کے جھونکوں سے گرے اخروٹ جمع کر کے بڑے بڑے چولہوں کی بھوبھل میں بھنے بھٹوں کے ساتھ نوش کرتے۔

میرا جی چاہتا کہ ایک بار پھر چھوٹی سی ہو جاؤں اور گاؤں میں پیدا ہو کر ایسے ہی جیوں۔ مگر نہیں۔ اتنی بڑی ہو کر بھی جب سارہ مجھے بچی سمجھ کر دور دور رہتی تھی تو اس وقت کیا ہوتا۔ میں ہر عمر میں اپنی عمر سے بڑی جو رہی ہوں۔ ورنہ سارہ کا اور میرا کیا جوڑ...... خیر ...... جانے کیوں ہم شہر میں رہے۔ میرا جنم بھی وہیں ہوا...... ورنہ چچا جان دادا حضرت کے ساتھ گاؤں میں ہی رہ رہے تھے۔ سینکڑوں میلوں تک پھیلا تعلقہ ...... ساری دنیا جیسے اپنی...... کھیتوں کے کنارے آسمان سے ملے ہوئے، جیسے آسمان بھی اپنی ملکیت میں شامل ہو۔ شہر کے اتنے کشادہ بنگلے میں رہ کر بھی یہاں کی وسعت کا مقابلہ نہیں ہو سکتا تھا بس امتحانات کے بعد خزاں کی شروعات میں فصلیں پکنے کے وقت، ہم لوگوں کا چکر لگتا اُدھر ......

آپا نے شوقیہ نوکری کرنے کا تجربہ کرنے کی خاطر ادھر تقرری کروائی تھی۔ اور ان کے شوق کی تکمیل اس ایک بچے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ورنہ اگر شاگرد ہی نا ہوتا تو آپا کس طرح اُستاد کہلاتیں۔ یہ بچہ آپا کے پرائمری اسکول کا اکلوتا سنجیدہ طالب علم تھا۔ وقت کا پابند عمر پانچ برس...... سب بچے چلے جاتے مگر وہ وقت ختم ہونے سے پہلے، جب تک کہا نہ جائے کہ چھٹی ہو گئی۔ کبھی کلاس سے نہ نکلتا۔ خاموش خاموش سا۔ نہ کمزور نہ تندرست، مگر منموہنا سا۔ ذہین بھی بھولا بھی۔ گندمی رنگت تھی اس کی۔ اس کی ماں اس کے کالے کالے بالوں میں ذرا سا تیل ڈال کر ٹیڑھی مانگ نکال دیتی جو اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں کے ساتھ خوب میل کھاتے۔

"کیا نام ہے تمہارا"؟ اسے پابندی سے آتا دیکھ کر آپا نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"بابر۔" وہ کھڑا ہو گیا اور آپا کی طرف دیکھ کر گردن کو بائیں طرف ہلکا سا خم دے کر نظریں جھکالیں اور دھیمی آواز میں اپنا نام بتایا۔

"بابر کا مطلب جانتے ہو۔" آپا نے نرمی سے پوچھا۔ "جی"۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولا...... پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"ذرا بتاؤ تو ہمیں۔"

میں اس کے قد کے برابر اس کے سامنے بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وہ لمحہ بھر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر میرے ہاتھ جلدی سے اپنے شانوں سے جھٹک کر کچھ اونچی آواز میں بولا۔

"بابر کا مطلب شیر ہوتا ہے...... میں شیر ہوں...... شیر ببر...... جو میری ماں کو مارے گا میں...... میں اس کو کھا جاؤں گا...... مگر میں...... ابو...... ابو کو"...... اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور چپ چاپ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اور آپا نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک اور تعجب کی بات بھی تھی کہ ایسے لوگوں میں جہاں کا تلفظ رحیم کو رخیم اور حبیب کو خبیب کر دیتا، بختاور کو بخاور بلایا جاتا وہاں اس بچے کو اپنے نام کے معنی تک معلوم تھے۔ اس کا باپ کمرا (قمرالدین) تو جاہل تھا۔ وہ ہمارے اناج لے جانے والے ٹرک کا ڈرائیور تھا۔ پینے کی عادی بھی تھی، ایک دن کا کام تین دن میں کر کے آتا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بابر کی ماں...... ہاں بابر کی ماں اچھے گھر کی ہوگی۔ وہ اس طرف کے گاؤں کی نہیں تھی۔ اس کے گاؤں اور اس علاقے کے بیچ میں شہر آتا تھا۔ کمرا جب اس سے شادی کرنے گیا تھا تو دس دن بعد لوٹا تھا۔ لڑکی کے والدین نہیں تھے۔ نانا نے لڑکی کی پرورش کی تھی۔

میں نے اپنے اندر جاگے تجسّس کو بابر کی ماں سے ملاقات کی شرط پر بہلا لیا۔ مگر اس کی ماں سارہ تھی کہ بغیر کام کے پل بھر بھی نہ ٹھہرتی تھی۔

بابر کے نام بتانے والے واقعے کے بعد سے آپا کو بھی اس کی امی کے بارے میں جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب وہ اسے لینے آئی تو میں نے جلدی سے پوچھ لیا کہ کیا وہ تعلیم یافتہ ہے۔ ساتھ ہی آپا نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ بابر کی ٹیچر کو منع نہ کر سکی......

اس نے بتایا کہ وہ صرف قرآن شریف پڑھی ہے...... اس کے نانا پڑھے لکھے تھے...... مولوی فاضل تھے۔ بس ان کے علم سے کچھ سیکھ لیا تھا۔ قمرالدین کے والد سارہ کے چچا کے دوست تھے انہی کی وجہ سے رشتہ ہوا تھا۔ نانا آخری عمر میں علیل رہا کرتے تھے۔ ہاں کر دی۔ شادی کے تیسرے دن انتقال کر گئے۔ یہ کہتے کہتے سارہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اس کے ابا نے بمشکل چوتھے تک رکنے دیا۔" اس کے آنسو بہہ نکلے۔

"نہیں روتے نہیں...... نہیں۔" میں نے جلدی سے اٹھ کر فرش پر بیٹھی سارہ کے

آنسو پونچھے۔ آپا کرسی پر بیٹھی چپ چاپ سنتی رہیں۔

"نانا کلام پاک کا ترجمہ سنایا کرتے...... ہر صبح...... کوئی آدھ پون گھنٹہ۔ آخری دم تک نماز نہ چھوڑی تھی۔ مرنے سے کچھ دیر قبل لیٹے لیٹے ظہر کی نماز اشاروں سے ادا کی۔ مجھے یٰسین شریف پڑھنے کو کہا۔ سورۃ ختم ہی ہوئی تھی کہ...... ان کا قرآن پڑھنا...... لفظی ترجمہ سنانا۔ سمجھانا...... حدیث شریف بتانا......" سارہ ہچکیاں لینے لگی...... پھر ہچکیوں کو کہیں نگل کر بولی۔

"میں نانا اور بکری تھے گھر میں...... میں ان دنوں بہت خوش ہوا کرتی تھی۔ دلہن بن کر سسرال جانے کا کوئی شوق نہ تھا...... ساری زندگی تلاوت و تفسیر سنتے سنتے گزار دینا چاہتی تھی۔ مگر تقدیر میں اس گاؤں کا پانی تھا۔" اس نے اوڑھنی سے آنکھیں صاف کیں۔

تقدیر پھر تقدیر ہے۔ کہاں یہ صوم و صلوٰۃ کی پابند خاتون اور کہاں وہ رندِ بلا نوش۔

اس دن میں کافی دیر تک ان ماں بیٹوں کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ ہمارے گھر میں بھی سبھی سارہ کی عزّت کرتے تھے۔ اسے دیکھ کر دل میں احترام سا جاگ اُٹھتا۔ دل خواہ مخواہ دُعا سلام کرنے کو چاہتا۔

باقی کاشت کار گھرانوں کی خواتین کی طرح وہ کبھی کچھ مانگتی نہیں تھی۔ دادی اماں خود ہی کوئی نہ کوئی چیز اس کے ساتھ کر دیتیں، مٹھائی، گھی، شہر سے آئی کوئی سبزی وغیرہ۔

جب میں نے دادی اماں سے اس کا ذکر کیا تو وہ مسکرائیں۔

"مجھے پہلے ہی محسوس ہوتا تھا کہ کسی شریف گھر کی لڑکی ہوگی۔ مگر یہ شرابی ایسی شائستہ بیوی پا کر بھی سدھرنے کا نام نہیں لیتا...... صبح آئی تھی...... دو دن سے قمرالدین گھر نہیں آیا نا۔ پوچھ رہی تھی۔ اب آئے گا تو خبر لوں گی۔ بدبخت کہیں کا، اچھے اور برے کی تمیز نہیں دیوانے کو۔" دادی اماں نے سفید ململ کی مقیش لگی ساڑی کا پلّو ماتھے تک کھینچ کر کانوں کے پیچھے پھنساتے ہوئے کہا تھا۔ پھر کچھ سوچنے لگی تھیں۔

میں اس دن کے بعد سارہ کو زیادہ غور سے دیکھنے لگی۔ مجھے اس میں خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ہر روز وہ بچے کو اسکول چھوڑنے آتی تھی۔ دونوں ماں بیٹے پاک صاف سے۔ سارہ کے پاس کچھ زیادہ ملبوسات نہ تھے مگر جتنے بھی تھے تقریباً سیاہ رنگ کے ہی تھے ڈھیلے ڈھالے سے، جسمانی زیبائش کو عیاں نہ ہونے دینے والے...... پروقار، سراپا سادگی۔ خاموش سی۔ میں نے اسے مسکراتے کم ہی دیکھا تھا۔ تقریباً نہ کے برابر۔ بچے کو کلاس میں بٹھاتی تو

دروازے پر کھڑی رہ کر کچھ دیر اسے دیکھتی۔ شاید ہلکے سے مسکراتی۔ مبہم سی مسکان، ہونٹوں میں گم ہوتی ہوئی سی۔ اور بابر صرف تکتا رہتا ماں کو جب تک وہ اوجھل نہ ہو جاتی اس کی نظروں سے۔

ایک دن وہ گھر جانے والی تھی تو میں نے اسے آواز دی۔

"کچھ دیر رکا کرو نا سارہ۔ وہ ٹھہر گئی...... مجھے دیکھنے لگی...... چہرے پر ملے جلے سے تاثرات لیے ہوئے، جیسے مسکرانے لگی ہو...... مسکرانا چاہتی ہو یا پھر...... جانے کیا۔

"جلدی تو نہیں ہے جانے کی......" اس کے لب ایک طرف سے مسکرائے چہرے پر شگفتگی اور نرمی سی چھا گئی۔

"جی نہیں کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔" اس نے حلیمی سے جواب دیا۔

"اتنی سنجیدہ کیوں ہوا کرتی ہو۔" میں ایک بڑے سے ٹوٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گئی اور ذرا سا کھسک کر اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی تو وہ سچ مچ مسکرا دی۔ اور آ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ اسے واقعی میری عمر کی لڑکی سے اتنے سنجیدہ سوال کی امید نہیں تھی۔ مگر پھر کچھ لمحے بعد وہ خود سنجیدہ ہو گئی۔

"جی بس کبھی کبھی عجیب سی ہو جاتی ہے طبیعت۔"

"بھائی مجھے تو تم اچھی خاصی غمگین نظر آیا کرتی ہو..... بتاؤ...... سچ ہے نا...... کیوں رنجیدہ رہتی ہو...... میں نے تو تمہیں ہمیشہ تنہا اور اداس دیکھا ہے۔ تمہاری کوئی سہیلی نہیں نا...... مجھے اپنی چھوٹی سی دوست سمجھ لو......" میں ہنس دی۔ بس اس بات کے بعد اور کوئی بات نہ ہوئی...... وہ مجھے کئی سیکنڈ تک دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں تو اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے اس کا سر اپنے شانے پر ٹکا دیا تو وہ ہچکیاں لیتی ہوئی رو پڑی۔ اس کی سسکیاں تھیں اور میرا کندھا۔ میں نے کچھ اور پوچھا نہ اس نے کچھ کہا۔

اس کے بعد وہ کبھی کبھی میرے پاس کچھ وقت کے لئے رہ جاتی۔ جاہل قمرالدین نہ صرف فحش کلامی کرتا بلکہ ہاتھ بھی اٹھایا کرتا۔ بچے کی موجودگی کا خیال کیے بغیر۔ جتنا وقت گھر میں ہوتا، لڑائی جھگڑے کے نئے نئے بہانے تلاش کر کے اس کو دق کرتا۔ دوپہر تک سوتا رہتا۔ یکطرفہ بحث کے نئے نئے موضوع ایجاد کرتا۔

"پتہ نہیں میرا کیا قصور ہے۔ کوئی رشتہ دار ہوتا آس پاس کہیں۔ تو ہمیں بتاتا کہ خرابی

کہاں ہے۔ میں خود کو ٹھیک رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ مگر مجھے خود پتہ ہی نہیں چلتا۔ میں اپنی طرف سے سب کام اچھے ڈھنگ سے کرتی ہوں...... مگر......" ایک دن باتیں کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"مجھے تو تم میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی...... بلکہ تم تو خوبیوں کا مجموعہ ہو۔"

"نہیں کچھ بات ہے۔جو میں سمجھ نہیں پاتی کہتا ہے کہ دو حرف پڑھ لیتی ہو۔اس کا مطلب یہ تو نہ ہوا کہ تم مجھ سے کوئی بڑی شخصیت ہو۔ حالانکہ میں نے کبھی ایسا کہا نہ سوچا۔"

پھر کئی دن سارہ نہیں آئی۔ نہ ہی بابر۔ آپا اپنے اکلوتے طالب علم کا بڑی لگن سے انتظار کرتیں۔ ایک دن گھر میں کسی نے بتایا کہ سارہ کو اس کے شوہر نے بری طرح زدو کوب کیا ہے۔ سارہ کا کوئی دور کا رشتہ دار کسی کام سے آیا ہوا ہے۔ قمرالدین کہتا ہے کہ سارہ کا اس کے رشتہ دار کے ساتھ کچھ.... کہ سارہ اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔

میں یہ سن کر حیران رہ گئی۔ سارہ اور یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قمرالدین اس کے بعد سے غائب ہے۔ کئی دن ہو گئے... کسی نے قمرالدین کو شہر میں دیکھا تھا۔ کیسی ہے سارہ۔ میرا جی چاہا سارہ کے گھر چلی جاؤں۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ دروازے کے قریب بندھی بکری نے بید کی شاخوں سے ہرے ہرے پتے چباتے ہوئے مجھے ایک نظر دیکھا اور نہایت معصومیت سے سر جھکا کر، میں، کی صدا دی۔ اندر گئی تو بابر دھان کی گھاس کی بنی چٹائی پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو چہکتا ہوا قریب آ گیا۔

"ارے۔ آپ۔ یہ دیکھئے میں نے دونوں طرف سے تختی لکھی ہے۔ میں بہت کھیلتا ہوں۔ کئی دن سے کوئی شور ہی نہیں مچا۔ ماں روئی بھی نہیں...... بہت مزہ آیا۔ ماں اچھی ہو جائے گی نا...... تو...... تو میں اسکول آؤں گا۔ پرسوں آؤں گا۔ سوموار کو۔"

اس نے واقعی بڑی صفائی سے دونوں طرف لکڑی کی سیاہ تختی پر سفید ملتانی مٹی سے اپنا سبق لکھا ہوا تھا۔ ایک طرف حروف ایک طرف ہندسے۔ اسے میں نے پہلی دفعہ اس طرح ہنستے کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔

"ماں کو بلاؤں۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں تم کھیلو۔ میں جاتی ہوں اندر۔"

سارہ کا گھر لکڑی کا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر تھا۔ میں نے جوتے باہر اتار دیے تھے، بکری سے ذرا دُور۔ اندر اگر بتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سارہ باورچی خانے میں نہیں تھی۔ کھانا پکا چکی تھی کہ مٹی سے تازہ پُتے چولہے سے سوندھی سوندھی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اور باورچی خانے میں فرحت بخش سی حرارت تھی۔

دوسرے کمرے کی طرف گئی تو دروازے کی دہلیز کے قریب ایک پرانا سا سفری بیگ رکھا ہوا تھا۔

اندر سارہ دونوں ہاتھ دعا میں اُٹھائے کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف رخ کیے بند آنکھوں سے جانے کہاں دیکھ رہی تھی۔ اس کے زرد رخساروں پر آنسو ڈھلک رہے تھے اور چہرے پر ایک پُرسکون تقدس چھایا ہوا تھا۔ کمرے کی دوسری دیوار کے قریب سارہ کے خاصے ضعیف اور بزرگ رشتہ دار جائے نماز پر دوزانو تلاوت کلام پاک میں محو تھے۔ ان کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ سفید لمبی داڑھی رحل کے کنارے سے چھو رہی تھی۔ وہ ہر آیت کا ترجمہ پڑھ کر تفسیر بیان کر رہے تھے، رحل کے دوسرے کونے پر شب چراغ کی تسبیح، جاڑوں کی اترتی شام کی ہلکی روشنی میں دمک رہی تھی۔

افطار میں بس چند منٹ ہی باقی تھے۔

□□

(ماہنامہ ''آجکل'' نئی دہلی،۱۹۹۹ء
''جہات'' سرینگر،۱۹۹۹ء
انتخاب ماہنامہ ''آجکل'' نئی دہلی،۲۰۰۰ء)

مائیں

''بہت گرمی لگ رہی ہے ماما''...... میرے آٹھ سالہ بیٹے نے نیند کے خمار سے نڈھال اور گرمی کی شدت سے بے حال ہو کر کہا تو میں جو خود گرمی کے مارے کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی اور خود کو سوتا ہوا سمجھ رہی تھی، یکلخت جاگ گئی۔

''ہاں بیٹا! جانے کیوں آدھی رات کو بجلی چلی گئی۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کسی طرح روشنی کر کے دو پنکھیاں اٹھالائی۔

دونوں بچوں کے درمیان بیٹھ کر انھیں پنکھا جھلنے لگی۔

آج دن بھی بہت مصروف تھا۔ سورج جیسے جسموں کے قریب ہو کر تموز پھینک کر رہا تھا۔ میں امّی کا ٹکٹ لینے کے لیے گئی تھی اور تقریباً ناکام ہی لوٹی۔ گرمی کے اچانک شدید ہو جانے سے لوگ پہاڑوں کو روانہ ہو رہے تھے۔ تین دن بعد کا ایک ٹکٹ تھا مگر منتظر فہرست میں۔

یہ تیسرا چکر تھا میرا ٹریول ایجنسی میں۔ ایک مختصر سی اُڑان اور اتنے دنوں کی پریشانی۔ سارے دن میں پسینہ بن کر بہہ گئی تھی۔ دو تین جگہوں پر گئی مگر بات نہ بن پائی۔

شام کو امّی سے سارا ماجرا کہا۔ وہ خاموش سنتی رہیں، مگر ان کے چہرے پر اُبھرے ڈوبتے کرب کو میں محسوس کر کے اُداس ہوتی رہی۔ سردیوں میں وہ کچھ وقت میرے پاس گذارا کرتیں۔ مگر گرمیوں کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہ روانہ ہو جاتیں۔ دس بارہ دن پیشتر خاصا خوشگوار موسم تھا۔ انھوں نے کہا بھی تھا کہ نشست محفوظ کروالوں اُن کی، مگر میں نے سوچا، کچھ دیر اور ٹھہر جائیں یہاں۔ ابھی موسم بہتر ہے۔ مگر موسم کیا بدلا کہ —— پریشان ہو گئی میں۔

امّی پہاڑ کی تھیں...... جھیلوں، چشموں اور ہریالی پر زندہ رہتی تھیں۔ ان موسموں کی عادت نہ تھی انھیں۔ گرم ہوا کی ایک لہر اُن کے ضعیف وجود کو ایسے جھنجھوڑ دیتیں کہ وہ تمازت سے جھلس جھلس جاتیں۔

میرے شوہر شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ورنہ یہ ٹکٹ وغیرہ کا کام وہی کیا کرتے ہیں۔

"ماما...... زور سے جھلئے ناپنکھا......" میرا دوسرا بیٹا جو اس سے کوئی ڈیڑھ برس بڑا تھا، باہیں اور ٹانگیں پھیلا کر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے بولا۔ میرا ہاتھ تیز تیز چلنے لگا۔ کافی دیر سے میں دونوں ہاتھوں سے پنکھیاں جھل رہی تھی۔ میری دونوں آنکھوں کی پلکوں پر پسینے کے قطرے اٹکتے اور بہہ جاتے۔ ہتھیلیوں کو بھی بار بار پونچھنا پڑتا تھا۔ ورنہ پنکھیوں کی ڈنڈیاں ہاتھوں سے پھسل جانے لگتی تھیں۔

آج دن میں کچھ دیر کے لیے بجلی چلی گئی تھی۔ جنریٹر میں پیٹرول نہیں تھا۔ مگر کمرے چونکہ ٹھنڈے تھے اور کچھ دیر بعد بجلی آگئی تھی۔ اس لیے مجھے اور بچوں کو پریشانی نہیں ہوئی، مگر امّی کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ادھر اُدھر بیقرار چکر لگاتیں، کبھی غسل خانے میں جاکر اپنے لباس پر پانی چھڑکتیں۔ کبھی باورچی خانے میں جاتیں، بہت سا پانی پیتیں۔ میں دُعائیں مانگتی کہ جلد آجائے بجلی۔

اور اب یہ رات بھی کسقدر تپتی ہوئی تھی۔ نیند مجھ پر غلبہ کیا چاہتی تھی۔ اس شدید گرمی میں اگر کچھ دیر آنکھ لگ بھی جاتی تو سونہ پاتی کہ بچے بے چین ہو اٹھیں گے۔ ان کے آرام میں خلل پڑے گا تو صبح وقت پر بیدار نہیں ہوں گے۔ سکول میں اونگھنے لگیں گے۔ سرزنش ہوگی۔ اس وقت قدرے پُرسکون لگ رہے تھے۔ چہروں پر کھڑکی سے جھانکتی ہوئی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ کاش بجلی آجاتی اور وہ سکون سے اپنی نیند پوری کر لیتے ...... میں بھی کچھ دیر سو جاتی۔

اچانک مجھے خیال آیا۔ شاید امی بھی سو نہ پا رہی ہوں۔ یا شاید چھت پر چلی گئی ہوں مگر...... انہیں چھت کا خیال کہاں آئے گا۔ اس دفعہ پہلی بار تو ہوا ہے ان کو گرمی کا تجربہ...... میں بھول ہی گئی...... یہ خیال مجھے بہت پہلے آجانا چاہیے تھا...... جو دن میں تھوڑی سی گرمی میں اتنی بے چین ہوئی تھیں۔ وہ...... وہ...... اس وقت......

میں تو بھول ہی گئی......

بچوں کا پنکھا چھوڑ دوں گی تو وہ جاگ جائیں گے...... مگر......

امی کے کمرے کی طرف چل دی۔ راہداری طے کرنے کے دوران میری نظر امی پر پڑی تھی۔ وہ کمرے میں کھڑی دکھائی دیں۔ کچھ پل بعد...... بیٹھ گئیں...... پھر کھڑی ہو گئیں...... آہستہ آہستہ چلتی ہوئی برآمدے کے دروازے تک گئیں...... دروازے کا دستہ پکڑ کر اسے کھولنے لگیں...... پھر دستہ چھوڑ کر کمرے کی طرف پلٹیں...... کمرے کا ایک چھوٹا سا چکر کاٹا...... پھر برآمدے کے دروازے تک جا کر دوبارہ کمرے کی دیوار تک آئیں...... پھر دوسری دیوار تک......

کسی تنگ پنجرے میں قید پرندے کی طرح وہ ادھر اُدھر پریشان اور بے حال تڑپ رہی تھیں۔ گرمی نے انہیں بری طرح سے بے چین کر رکھا تھا۔ اور یہ سب میں نے محض مختصر سی راہداری میں چلتے ہوئے دیکھا تھا۔

"امی...... آپ...... آپ ٹھیک ہیں نا......؟"

"ہاں بیٹا...... میں...... میرا دَم گھٹ رہا ہے...... شاید...... میری موت...... مجھے یہاں کھینچ لائی ہے......" وہ رک رک کر بولیں۔

"نہیں امی...... ایسا نہ کہیے...... چلئے...... چھت پر چلتے ہیں...... آیئے۔"

"تم نے...... پہلے...... کیوں نہیں بتایا...... چھت پر کچھ بہتر ہو گا...... کیا؟"

"جی ہاں...... جب گھر میں بجلی نہیں رہتی...... تو لوگ اندر کہاں رہ پاتے ہیں گھر کے باہر ہی کچھ ٹھنڈک سی محسوس ہوتی ہے...... آیئے۔"

میں نے اندھیرے میں ان کا ہاتھ پکڑ کر زینہ طے کرتے ہوئے کہا۔

برآمدے والا دروازہ...... بہت شور مچاتا ہے بیٹا۔ برآمدے میں ہی رہ جاتی کچھ دیر...... اس کے قبضوں میں تیل ڈلوا دینا...... میں اسے کھول دیتی تو...... تو کچھ سانس...... مگر تمہاری نیند تو بہت کچی ہے...... کہیں جاگ جاتیں...... پھر...... پھر بچے بھی...... اگر...... کھولتی تو...... تم سب کی نیند خراب ہو جاتی...... ورنہ...... کچھ ہوا...... کچھ سانس...... تم بھی گرمی سے جاگ گئی نا......

میرے بچی......! اور بچے......؟" وہ تیز تیز سانس لیتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

"نہیں امی! میں تو بہت پہلے بجلی کے جاتے ہی جاگ گئی تھی۔ بچوں کو پنکھا جھل رہی تھی۔ میں سمجھی...... میں نے سوچا...... کہ آپ...... آپ۔ میں تو بھول ہی گئی تھی...... کتنی تکلیف ہوئی آپ کو......"

چھت پر واقعی ہوا چل رہی تھی۔ میں جلدی سے بچوں کو لانے نیچے کی طرف بھاگی۔ پھر آدھے راستے سے واپس چھت پر آکر چارپائیاں بچھانے لگی۔ امی کھڑی کھڑی لمبے لمبے سانس لے رہی تھیں۔

"آیئے اس چارپائی پر لیٹ جایئے۔" میں نے دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی جلدی سے بچھائی...... "آیئے...... میں تو بھول ہی گئی" امی چارپائی پر لیٹ گئیں تو میں نے ایک اطمینان بھری نظر ان پر ڈالی۔ لیکن مجھے اپنے حلق میں کچھ اٹکا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا پھر پل بھر بعد میں نیچے کو چل دی۔

بچوں کو پنکھی جھلتے وقت میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔

□□

آبلوں پر حنا

نیلما تقریباً بے تاثر چہرے سے ان دونوں کو بار بار دیکھنے لگی۔
"سچ کہہ رہی ہوں میں......" شیریں نے ابرو اٹھا کر سر ہلا کر کہا۔
"کیوں تانیہ؟"
"ہاں بالکل مجھے تم سے اتفاق ہے...... دیکھو نیلما اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو اسی طرح تم ضائع ہوتی رہو گی۔ کبھی تندرست کبھی علیل۔ اور زندگی ختم ہو جائے گی۔" تانیہ نے سر جھکا لیا اور نیلما ان دونوں کی طرف پیار بھری مسکراہٹ لئے دیکھتی رہی۔
"چائے پیو گی تم لوگ۔" نیلما نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"نہیں پہلے تم ہماری بات سنو۔" شریں نے نیلما کا بازو کھینچ کر اسے کرسی پر بٹھادیا۔
"بلکہ اتفاق سے آج ہماری مہینے بھر بعد صلاح ہوئی اس لئے میرا موڈ اچھا ہے...... تانیہ کو معلوم ہے" "اس لئے تم میری بات سنو شیریں نے کہا۔
"ہاں صبح جب میں ان کے ہاں گھر کی چابی رکھنے گئی تو بہت محبتیں تبدیل ہو رہی تھیں۔ مجھے بہت اچھا لگا...... یونیورسٹی کے دن یاد آگئے۔ جب میں ان دونوں کے پیغامات ایک دوسرے تک پہنچایا کرتی تھی۔ بلکہ آج تو میں گھر سے کچھ دیر پہلے یہ ہی سوچ کر نکلی تھی کہ ان دونوں کو پرانے دنوں کا واسطہ دے کر منالوں۔ وہ ایک دوسرے سے الگ رہ کر بھی جدا نہ رہنا۔ وہ اپنی اپنی جماعتوں میں رہ کر مجھے پرزے دے دے کر دوڑانا۔ وہ لگاوٹیں، وہ نزاکتیں کہ:

رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد
یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد

ارے بھئی وہ دن کیا ہوئے کہ ایک دوسرے کی پسند طبع کا اسقدر احترام کیا جاتا تھا۔ اور اب؟

مگر مجھے یہ سب کہنے کی ضرورت نہ پڑی..... حالات معمول پر آ چکے تھے..... "ثانیہ نے لمبی سانس لے کر بات ختم کی۔

"اصل میں عادل روز بہ روز اب کچھ زیادہ ہی agressive ہو رہے ہیں..... چھوٹی سی فیملی ہے ہماری۔ ہم دو اور شیبا..... بچی پر ان کے غصہ کا برا اثر نہیں پڑ سکتا؟..... کسی نہ کسی بہانے اکڑتے رہتے ہیں مصروف رہوں تو منہ پھلائے۔ بیٹھی ہوں تو منہ لٹکائے۔ شادی سے پہلے کتنے اچھے انسان تھے عادل....... کتنے اچھے دوست تھے ہم دونوں۔ اب بھی دیر سے آتے ہیں کبھی بغیر بتائے چلے جاتے ہیں۔ ہر بات پر بحث کرنے پر تل جاتے ہیں..... اپنی غلط باتوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے۔ باہمی سمجھوتہ تو جیسے رہا ہی نہیں ہمارے درمیان..... ہاں جب کبھی مہینوں گفتگو کرنا ترک کر دوں تو کچھ دن کے لئے راستے پر آجاتے ہیں۔ گھر میں اور ہے ہی کون کہ دو باتیں کر لوں..... چاہے کڑھتی رہوں۔ مگر بولتی نہیں میں ان سے..... خیر بھئی..... شکر ہے کہ آج تو حالات میں تناؤ نہیں ہے..... اب دیکھئے..... "شیریں نے بات ختم کی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"بھئی مردوں کا تو بس ایسے ہی ہے..... دھونس جمانے کی فکر میں رہتے ہیں ہر وقت..... میں نے اکبر سے کتنی دفعہ کہا کہ اپنے محکمہ میں فلیٹ کی عرضی دے دے..... اتنے بڑے افسر ہیں..... آسانی سے مل جائے گا۔ مگر نہیں۔ رہیں گی اسی بھڑوں کے چھتے میں۔ ان کی والدہ کو تو جھیل رہی تھی۔ اب ان کی بہن بھی اس شہر میں آ گئی ہیں..... "ثانیہ نے کہا۔

"اٹھ..... چائے..... بنالا..... ہوسٹل کی طرح تینوں بیٹھ کر پئیں گے اور پرانے دن یاد کریں گے۔" شیریں نے نیلما کی کمر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں بنالاتی ہوں شیریں۔ نیلما تمہارے پاس بیٹھے گی۔"

"اچھا ایسا کرتے ہیں کہ سب مل کر بناتے ہیں..... چلو کچن میں..... تم باتیں بھی کرنا اور مجھے چائے بناتے ہوئے دیکھنا۔"

شریں نے مسکرا کر اٹھتے ہوئے کہا..... اور وہ تینوں چھوٹی سی رہداری طے کر کے نیلما کے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ ایک خوابگاہ والا یہ فلیٹ خاصا خوبصورت تھا۔ ایک نشست گاہ۔ مختصر غلام گردش جسے نیلما نے لائبریری میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک طرح یہ حصہ اس

کی سٹڈی بھی تھا۔ اس چھوٹے سے دو نفری کرسی میز پر وہ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتی تھی اور کھانا وغیرہ بھی وہیں ہو جاتا تھا۔

"تم نے گھر کو خوب سجا رکھا ہے...... بس ایک ہی کمی ہے......" تانیہ نے ہونٹوں کے خم میں مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے عیاں کر کے کہا......اور دونوں کو باری باری دیکھنے لگی۔

"...... میرا مطلب ہے، گھر ہے...... گھر والی ہے...... ایک گھر والا بھی اب ہو ہی جائے۔"

تانیہ نے اپنی بات ختم کر کے قہقہہ لگایا۔ نیلما گردن کو خم دے کر ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ لئے چائے کی پتی کے ڈبے سے ہتھیلی پر پتی ڈالنے لگی۔

"میں نے کئی دفعہ عادل سے کہا کہ لابی (Loby) میں اتنی جگہ ضائع ہو رہی ہے۔ اس میں کتابوں کی الماریاں شفٹ کر دیں گے تو بیڈ روم میں خاصی جگہ نکل آئے گی مگر وہ تو کبھی اچھے موڈ میں ہو تو...... ورنہ......"

شریں سنجیدہ نظر آ رہی تھی......

"ورنہ بس...... ایسے دیکھے گا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ بھئی حد کرتا ہے وہ...... لاؤ ادھر رکھو پیالیاں......" شیریں نے ٹرے نیلما کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تانیہ وہ بسکٹ رکھے ہیں اس سرخ ڈھکن والے ڈبے میں...... چلو ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔"

"نہیں نیلما...... تمہارے بیڈ روم میں بیٹھتے ہیں...... میں لیٹنا بھی چاہتی ہوں، ذرا میرے اندر کا ٹیڈی بیئر بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے...... تم لوگ مونڈھوں پر بیٹھ کر میرے ہاتھ پاؤں دابنا۔" اس بات پر سب ہنسنے لگیں۔

"ٹھیک ہے بھئی کہ...... تم تھک بھی تو بہت جاتی ہو گی...... گھر میں کیا بتایا۔"

"وہی شاپنگ (Shopping) اور کیا کہتی...... وہ تو وہی دن تھے...... دیر بھی ہوتی تو امی کو معلوم تھا سب ساتھ ہوں گی۔ شیریں کے ہوسٹل روم میں...... یہاں تو تین تین کوتوال ہیں اور ایک معزور ملزم......" پھر قہقہہ بلند ہوا۔

"مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہاری نند تو اچھی خاصی پڑھی لکھی ہے...... وہ بھی۔" شریں نے کہا۔

"نہیں یار سب ایک سے ہیں بس بچے اچھے ہیں معصوم سے۔ ہماری جٹھانی کا بیٹا نو

برس کا......'' تانیہ اُداس سی ہو گئی۔

''تم لوگ تو جانتی ہو کہ آج کل مجھ سے کچھ کھایا پیا تو جاتا نہیں...... بس خربوزہ...... یا تیر بوز...... یا پانی شربت وغیرہ...... ایک خربوزہ کھا لیا تھا میں نے...... تو جواد کہنے لگا کہ چچی آپ کے پیٹ میں بھالو ہے نا...... تو میں نے کہا نہیں بیٹا...... ایسا نہیں کہتے...... تو کہنے لگا کہ امی تو کہتی تھیں کہ چچی نے پورا خربوزہ نگل لیا۔ پھوپھو اور دادی بہت ہنسی تھیں بولیں کہ بھالو جو پل رہا ہے اس کے پیٹ میں...... مگر اُس کی چھوٹی پانچ سالہ بہن نے پھر اتنے پیارے انداز میں اُسے سمجھایا کہ میں اُس بات کا دُکھ ہی بھول گئی۔''

''کیا کہا......'' شیریں نے پوچھا۔

''کہنے لگی کہ چچی کے پیٹ میں بے بی ہے نا چھوٹا سا ایسا۔ میرے ٹیڈی بیئر جیسا اگر چچی کچھ کھائیں گی نہیں تو بے بی ویک پیدا ہوگا...... پھر روئے گا...... میں نے اس کی بات سن کر اُسے سینے سے لگا لیا تھا...... دونوں بہن بھائی میرے پیٹ سے کان لگا کر بیٹھے رہے بلکہ اپنے ٹیڈی بیئر کو بھی ساتھ لگا لیا تھا...... پھر تھوڑی دیر بعد ان کی پھوپھی جان آئیں اور انہیں پڑھانے کے بہانے لے گئیں۔

زور زور سے کہہ رہی تھیں کہ تم لوگوں کو بھی کوئی کام نہیں کیا......

بے کاروں کے ساتھ بیکار ہو گئے ہو۔''

''یہ اچھی مصیبت کا اضافہ ہوا ہے۔ آخر شادی کیوں نہیں کی۔'' اس نے شیریں نے پوچھا۔

''بھئی میری نند کسی زمانے میں سنا ہے بہت خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ پریوں جیسی۔ پھر ایک شہزادہ آیا اور منگنی کر کے کینیڈا چلا گیا۔ نند نے کئی سال انتظار کیا پھر نوکری کر لی...... اچھا جاب (Job) ہے اس کا...... مزے میں ہے وہ تو...... اچھا تم میری نند کو گولی مارو...... اس نیلما کی بچی سے پوچھو کہ یہ شادی کب کرے گی۔؟'' تانیہ نے نیلما کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں نیلما...... اب تو تم شادی کر ہی ڈالو...... بہت سونا سا لگتا ہے تمہارا گھر۔؟''

''پھر کبھی کبھی بیمار بھی تو ہوتا ہے انسان...... تب؟'' تانیہ نے بات آگے بڑھائی۔ نیلما چپ چاپ چائے کے گھونٹ بھرتی رہی۔

"تمہارے لاشعور میں تناؤ ہے نیلما...... اسی لئے کبھی بیمار ہوتی ہو۔ کبھی پریشان نظر آتی ہو...... نہیں؟" شیریں نے کہا۔

"کیا کرتی ہو جب بیمار ہوا کرتی ہو اکیلے اکیلے؟" تانیہ نے نیلما کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کیا کرتی ہو؟" نیلما نے پلٹ کر سوال کیا۔

"ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ یا کوئی اور فون کر دیتا ہے۔ ورنہ خود ملنے چلی جاتی ہوں۔"

"میں بھی وہی کرتی ہوں۔" نیلما نے گردن کو شانے کی طرف خم دیکر کہا اور مسکرادی۔

"تنہائی میں کبھی کبھی انسان اداس بھی تو ہو جاتا ہے۔ کوئی تو ہو۔" شیریں نے کہا۔

"تم لوگ اداس نہیں ہوتیں؟" اپنی سوچوں میں تنہا نہیں ہوتیں۔ کیا زیادہ تر باتیں انسان اپنے آپ سے ہی کرنا پسند نہیں کرتا...... "نیلما دونوں کو باری باری دیکھ کر بولی۔

"ہاں بھئی...... بہت ہوتے ہیں۔" شریں اور تانیہ دونوں نے ایک ساتھ کہہ دیا۔

"پھر بھی نیلما...... شریکِ حیات پا کر انسان خوش تو رہتا ہے نا۔" کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد تانیہ نے کہا۔

"اور وہ تمہارا بچوں سے دیوانوں جیسا پیار...... تم ماں بھی نہ بننا چاہو گی؟"

شیریں نے نہایت آہستگی سے اپنا ایک ہاتھ تانیہ کے ابھرے ہوئے پیٹ پر رکھ دیا اور دوسرے سے نیلما کا رُخسار زور زور سے تھپتھپا کر ہنستے ہوئے کہا۔"

"کیوں...... ؟ کیا بچوں سے محبت کرنے کیلئے بچوں کو جنم دینا ہی سند ہے...... کتنی بڑھ گئی ہے آبادی...... کتنے تو ہیں بچے جن کا کوئی ہے ہی نہیں اس دنیا میں۔"

نیلما نے سنجیدگی سے کہا اور برابر کی سنگھار میز سے Nailfiler اُٹھا کر نیم دراز تانیہ کی انگلیوں کی ناخنوں کو ہلکے ہلکے گھسنے لگی۔

"کیسے ہو گئے ہیں تمہارے ناخن۔ تمہارے پاس اپنے لئے وقت نہیں۔" نیلما نے تانیہ کی طرف نظر اٹھا کر کہا اور دوبارہ ناخن گھسنے میں مشغول ہو گئی۔

اب تم موضوع بدلنے کی کوشش مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ ایک ساتھی کی ایک شریک حیات کو پانے کی ایک خوشی بھی تو ہوتی ہے۔" شیریں نے اس کا جھکا ہوا چہرہ اپنی شہادت کی

انگلی سے اوپر کو اٹھا کر کہا۔

"اچھا تم دونوں مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم دونوں مجھ سے زیادہ خوش ہو۔یا میں تم سے کم۔"

نیلما نے دونوں کے چہروں کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو اور پھر نیلما کو دیکھنے لگی۔

"ہاں سوچنا پڑے گا اس پر۔"

ثانیہ نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے ابرو اوپر اٹھائے اور سر نیچے کو ہلایا تو تینوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

❑❑

شام جی

کچھ تین ماہ بعد جب مجھے کوئی چار روز پہلے شام جی دکھائی دیئے تو میں نے حال احوال دریافت کیا ان کا، ان کی ''فیملی'' کا...... فیملی کی خیریت کی سوال پر ان کا چہرہ چمک سا گیا تھا۔ پھر چند لمحے بعد وہ کچھ اداس سے ہو کر بولے تھے کہ بینو کی طبیعت شاید ٹھیک نہیں ہے کہ وہ کمزور ہو گیا اور میری سمجھ میں کچھ ٹھوس وجہ نہیں آ رہی۔

ان کی سمجھ میں نہ آنے والی بات سن کر میں بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہو گی۔

شام جی سے میری پچھلی ملاقات ایک ادبی تقریب میں ہوئی تھی۔

''میں نے تو سنا تھا کہ آپ اپنی مادری زبان میں بھی لکھا کرتی ہیں ...؟'' میرے دائیں شانے کے قریب نیم سرگوشی جیسی سوالیہ آواز نے مجھے چونکا دیا تھا کہ میں ابھی ابھی اپنا کلام سنا کر واپس نشست پر آئی ہی تھی۔ اور اس آواز میں کچھ عجیب سا گلہ اور بیزاری تھی۔ جس کی اس وقت مجھے قطعی توقع نہیں تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

''میرا نام شام جی ہے۔'' انہوں نے اپنا شناختی کارڈ مجھے تھما دیا۔ جو اصل میں کاغذ کا ایک مستطیل ٹکڑا تھا۔ جس پر ان کا نام اور پتہ درج تھا:

شام ملک۔ سکریٹری ایشیائی ادب (بھارت)

میور وہار۔ پاکٹ۔ فیز۔ وغیرہ وغیرہ

''لوگ مجھے شام جی بلاتے ہیں''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے

میں نے شام جی کو اکثر سمینار میں دیکھا تھا۔ اکثر نہیں بلکہ ہمیشہ ہی۔ وہ سامعین کی صفوں میں اگلی قطاروں میں بیٹھے نہایت انہماک اور دلچسپی سے ہر ایک کو سنا کرتے تھے۔

وہ کوئی ۴۵،۴۸ برس کے رہے ہوں گے۔ گندمی سی رنگت۔ طویل قامت، دبلا بدن،

تقریباً سارا سر سفید اور مونچھیں بھی۔ مونچھیں بے ترتیب تھیں اور بات کرتے وقت کبھی کبھی ان کے منہ میں چلی جاتی تھیں جنہیں وہ الٹے ہاتھ سے دہانے کی باہری اطراف کو سنوارنے کی کوشش کرتے۔

وہ بائیں طرف سے مانگ نکالتے تھے۔اور ان کے کچھ بال ماتھے کا بایاں کونا ڈھکاتے ہوئے اور دایاں ابرو چھپاتے ہوئے ان کے کتابی چہرے کے دائیں جبڑے تک پہنچ جاتے تھے۔ان کی آنکھوں کی پتلیاں زردی مائل تھیں اور پیلے کنچوں جیسی معلوم ہوتی تھیں۔ان کے ابرو گھنے تھے۔اور ابروؤں کے بال اتنے لمبے کہ آدھے پپوٹوں کو ڈھکے رہتے تھے۔

جب انہوں نے میرے کان کے قریب منہ کر کے اپنا تعارف پیش کیا تھا تو ان کے سانس سے عجیب سی، بو آئی تھی۔ جیسے ...... جانور کی پوستین سے آتی ہے۔

میں نے اپنی ٹھڈی اپنے شانے سے لگائی اور چہرے کو اخلاقاً ذرا سا خم دے کر ان کی بات سننے لگی۔

"ہماری خواہش تھی کہ آپ کی زبان میں آپ کو سنتے۔"

شام جی نے پھر سرگوشی کی..... مائیک پر ایک خاتون پر سوز ترنم سے برہا کا گیت سنا رہی تھیں۔اور سامنے کی قطاروں میں اداس سر نفی میں ہل رہے تھے۔

"یہاں میری زبان کو کون سمجھتا ہے۔دو لوگ تھے جو پہنچے ہی نہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں اپنے شانے سے کہا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ کوئی نہیں سمجھتا۔اور بھی ہوں آپ کی زبان جاننے والے اور آپ ان سے واقف نہ ہوں۔ ایسا بھی تو ممکن ہے۔اور دوسرا یہ ابھی آپ سے پہلے والے شاعر تمل میں نظم سنا رہے تھے۔ پھر بھی ہمیں لطف آیا۔" وہ بھڑکی سی جھنجھناہٹ میں بولے۔

"ہال میں تو خاصے لوگ ہیں یہ زبان بولنے والے۔اور پھر ترجمہ بھی تو سنایا گیا تھا انگریزی میں۔"

"ترجمہ تو تھا ہی۔ مگر کیا تمل میں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔"

"آپ تمل جانتے ہوں گے۔"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"زبان سمجھنا تو بہت آسان بات ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میں بتاتا ہوں۔ دیکھئے اگر انسان ذرا سی دلچسپی لے....."

کچھ سر پیچھے کو مڑے۔ یکے بعد دیگرے۔ کچھ ساتھ ساتھ۔ جو اونگھ رہے تھے وہ بھی۔

مائیک ایک بزرگ کی ناک کے قریب تھا جو تیلگو زبان میں اپنی نظم سنا رہے تھے۔ اور شدت جذبات سے مغلوب ہو کر کبھی ایک بازو زور سے لہراتے اور کبھی دوسرے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے ایک دکھا کر اتنی طاقت سے ہاتھ جھٹکتے کہ خود بھی جھک جاتے اور یکلخت سیدھے ہو کر دوسرا مصرعہ پڑھتے ہوئے گھٹنوں کے پاس سے ٹانگوں کو کئی سیکنڈ کے لئے اتنا خم دیتے کہ ان کا قد چار چھ انچ چھوٹا دکھائی دیتا۔ پھر وہ پوری طرح استیادہ ہو کر مسکراتے اور دوسرا شعر پڑھتے۔

"میرے خیال سے ہم باقی باتیں چائے کے وقفے میں..."

"ہاں ضرور" انہوں نے میری بات پوری ہونے سے پہلے کہا۔

"مگر میں آپ کو یہ بتادوں کہ میں تیلگو نہیں جانتا اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ صاحب حب الوطنی کے اشعار پڑھ رہے ہیں۔ مائک پر غزل کے مترجم کا نام نشر ہوا معلوم ہوا کہ کچھ دیر بعد پہنچے والے ہیں۔

"ترجمہ پڑھنے والے صاحب ابھی غیر حاضر ہیں تب تک آپ لوگ چائے کے لئے تشریف لے جائیں۔"

نشستوں کی ترتیب نے ہال کو دو نصفوں میں بانٹ دیا تھا۔ اور دونوں جانب سے لوگ اپنی اپنی قطاروں سے نکل کر درمیانے راستے پر چل رہے تھے۔ میں بھی کھڑی ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔

"کیسے ہیں شام جی۔" کسی نے ان کی خیریت دریافت کی۔ انہوں نے اپنی پتلی انگلیوں اور تنگ سی ہتھیلی والا مستطیل ساخت کا ہاتھ مصافہ کرنے کو بڑھایا اور دوسرے ہاتھ سے چہرے پر آرہے بال کانوں کے پیچھے اڑس لئے۔

شام جی راہداری کی طرف چلنے لگے تو میں نے دیکھا کہ وہ سر اتنا آگے کو کیے ہوئے تھے جیسے سامنے والے کی گردن سونگھ رہے ہوں اور ایسا کرنے سے ان کی گردن عمودی

ہونے کے بجائے آڑھی نظر آتی تھی۔

''آج جلدی میں' میں بغیر چائے پیے ہی چل دیا تھا گھر سے۔ بہت طلب ہو رہی ہے چائے کی۔ آپ ذرا یہ پکڑیئے میں آپ کے لئے بھی لا رہا ہوں۔''

شام جی نے مڑے ہوئے کونوں والی ایک موٹی سی فائل میرے ہاتھ میں دے دی اور لمبی لمبی ٹانگوں سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے' دونوں بازوؤں کو سامنے کی طرف قوس کی شکل میں موڑے' گردن آگے کی طرف نکالے' کئی میزوں کو ساتھ ملا کر بنائے گئے چائے کے کاونٹر کی طرف بڑھے اور قطار میں گم ہو گئے۔

میں نے فائل اور اپنا پرس وغیرہ قریب کی میز پر رکھ دیئے۔ کچھ ہی منٹوں میں وہ چائے کی پیالیاں پرچوں پر رکھے اور ان کے کناروں پر دو ایک بسکٹ رکھے ہوئے آ گئے۔

''اصل میں صبح دودھ کم پڑ گیا تھا۔'' شام جی نے چائے کا گھونٹ بھرا اور جلد ی جلدی سر دائیں بائیں موڑتے ہوئے چائے کا گھونٹ نگلا۔

''ستمبر کی بات ہے...... '' وہ بسکٹ کترتے ہوئے گویا ہوئے ''میں گاؤں گیا تھا...... '' وہ سیلنگ کی طرف دیکھنے لگے۔

''ماں سے ملنے۔ ٹھیک نہیں رہتی ہیں نا۔ میں تو برسوں سے یہاں لانا چاہ رہا تھا۔ مگر چھوٹے بھائی کے بچوں کو چھوڑ کر آنا نہیں چاہتی۔ وہاں کوئی دو ہفتے رکا تھا۔ ۲۳ جولائی تھا جب میں لوٹا۔ اپنے گھر پہنچا۔ کمرے کی بات کر رہا ہوں۔ پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری کتابوں کی آہنی الماری کے نچلے خانے میں، جہاں اخبار اور رسالے وغیرہ رہتے ہیں، جیسے عین درمیان میں چھوٹی سی نشست بنائی گئی ہو۔ دونوں اطراف سے رسالوں کو دور دور کر کے اور کچھ ایک دو رسالے وہیں بچھے رہنے دے کر...... ساتھ میں کچھ کاغذ بھی پڑے ہوئے تھے۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایسا کچھ میرے پاس تھا بھی نہیں کہ کوئی کچھ تلاش کرتا۔ کھڑکیاں اور دروازہ بدستور بند تھے۔ میں نے خود ہی تالا کھولا تھا۔ کون کہاں سے کیوں کر اندر آیا سمجھ نہیں پایا۔ بعد میں جب مسہری پر لیٹا تو دیکھا کہ ایک بلی روشندان کی چوکھٹ پر پچھی ٹانگوں سے بیٹھی اور اگلی ٹانگوں سے کھڑی مجھے گھور رہی ہے۔ بھورے رنگ کی، دُم اور پنجے سفید۔ کچھ دیر یوں ہی گھورتی رہی جیسے کچھ مانگ رہی ہو۔ یا میری نیت بھانپ رہی ہو۔''

شام جی زور سے ہنسے، کچھ لوگ ہمیں دیکھنے لگے۔ ایک دو نے ایسی شکل بنائی جیسے سیمینار کے دوران چائے کے وقفے کے وقت ہنسنا صرف بیوقوفوں کا کام ہو۔ شام جی نے انہیں ایسے دیکھا جیسے کسی پاگل کو دیکھ رہے ہوں۔ پھر مجھے دیکھ کر بولے۔

''میں نے بلی کو دیکھ کر منہ سے پچکارنے کی آواز نکالی۔ مگر اسے شاید کوئی خوشی نہ ہوئی۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے شاید یہ طے کر لیا کہ میں کوئی ضرر نہیں پہنچاؤں گا۔ یا پھر اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ روشندان سے الماری پر کود پڑی۔ اور دائیں بائیں جلدی جلدی سر ہلا کر اس نے 'پُرر' کی سی آواز نکالی۔ کمرے کے جانے کس کس کونے سے تین ننھے ننھے بلوٹے الماری کے نچلے خانے میں جمع ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بلی گردن آگے کو نکال کر اور سر جھکا کر نیچے دیکھنے لگی پھر میری طرف دیکھ کر دوبارہ میاؤں بولی...''

شام جی نے جب 'میاؤں' کہا تو آس پاس کے لوگ چونک کر پلٹے۔ اور خود مجھے بھی حیرت ہوئی کہ شام جی نے من و عن بلی کی سی 'میاؤں' کی تھی۔ کچھ لوگ حیران سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر دلچسپی بھرے تاثرات تھے۔ میں اپنی مسکراہٹ پر سنجیدگی اوڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شام جی نے دیکھتے ہوئے لوگوں کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھا اور بات جاری رکھی۔

''میاؤں کچھ اس انداز سے ٹھہر ٹھہر کر بولی جیسے کہہ رہی ہو،

'ماں۔ ہوں'

'میں آؤں؟'

ہاں بھئی آجاؤ۔ تمہارا اپنا گھر ہی تو ہے۔ میں نے اسے پچکار کر کہا اور وہ جیسے یہ بات سمجھ گئی ہو اور کود کر نیچے آگئی۔ تینوں بچے اس کے دائیں بائیں لگے جا رہے تھے اور وہ کسی کا ننھا سا منہ چاٹتی کسی کو چھاتی کے نیچے ہلکا سا دبا لیتی۔ وہ دودھ پیتے، تو کبھی پنجوں سے سہلاتی کبھی کسی پر اپنا سر ٹکا دیتی۔ کبھی کوئی بلوٹا دودھ چھوڑ کر اپنی اماں کا گھوڑا بنا لیتا تو بلی جس طرح ہوتی اُسی زاویئے میں رہتی بالکل جنبش نہ کرتی کہ کہیں گھڑسوار توازن نہ کھو بیٹھے۔''

شام جی پھر ہنسے مگر اس بار منہ پر ہاتھ رکھ کر سر اِدھر اُدھر ہلاتے ہوئے۔ دھیما سا قہقہہ لگا کر۔ چائے شاید کم پڑ گئی تھی۔ کچھ لوگ منتظر تھے، کچھ ہال میں داخل ہو چکے تھے۔

''میں نے بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا کہ انھیں کمرے میں اچانک میری موجودگی اپنی ذاتی

زندگی میں مداخلت بے جانہ محسوس ہو۔" شام جی نے بات جاری رکھی۔

"پھر تو وہ میرے دوست ہو گئے۔ بلی خود خوبصورت تھی۔ دو رنگ کی پوستین والی، اس کا نام میں نے چتری رکھا۔ بچوں میں دو مادہ بلو نگڑے، ایک نر۔ ایک کی آنکھیں نہایت شفاف تھیں اُس کو میں نے نیلی بلانا شروع کر دیا۔ دوسری کو سریلی کہ وہ نہایت باریک آواز میں 'موں' کیا کرتی اور تیسرا بینو، اُس کی آواز بین کی تان سے مشابہ ہے۔

وہ اب میرے کنبے میں شامل ہیں۔ میری زندگی کا حصہ ہیں، کہ وہ مجھ کو اور میں ان کو سمجھتا ہوں۔ لوگوں کو تبھی ساتھ رہنا چاہئے جب وہ ایک دوسرے کو ہر پل سمجھنا چاہتے ہوں۔ اور ہر ایک 'دوسرے کی نظروں میں اپنی اہمیت اور قدر محسوس کرتا ہے۔ وہ سب میری سیٹی کی آواز زینے سے ہی پہچان لیتے ہیں اور دروازے کے اندر، دروازے سے اتنا قریب جمع ہو جاتے ہیں کہ مجھے نہایت احتیاط سے دروازہ کھولنا پڑتا ہے۔ جس کا نام لیتا ہوں وہی لپک کر آتا ہے۔ ہم سب مل کر رہتے ہیں۔ بانٹ کر کھاتے ہیں جس طرح میں سکھاتا ہوں ویسا ہی کرتے ہیں۔ بھوک لگتی ہے تو برتنوں کے پاس جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجھے ایک مخصوص آواز میں بلاتے ہیں۔ اور پیاس لگتی ہے تو فرج کے پاس رک جاتے ہیں کبھی کوئی نافرمانی نہیں کرتے۔ میں بھی ان کی ہر بات ہر اشارہ سمجھتا ہوں...... تو...... میں یہ کہہ رہا تھا جانوروں سے بھی انسان ہمکلام ہو سکتا ہے...... تو...... یعنی...... بغیر جیب اور ہونٹوں سے بولے بھی تو جسمانی حرکات کی ایک بولی ہوا کرتی ہے...... آنکھوں کی بھاشا ہوتی ہے، چہرے کے تاثرات کلام کرتے ہیں، آواز کا اپنا الاپ ہوتا ہے۔ اور مختلف وقت پر مختلف صداؤں کے اونچے نیچے سُر ہوتے ہیں...... پھر انھیں میرے موڈ کا تک پتہ چل جاتا ہے۔ میں ان کے ساتھ کھیلنے کے موڈ میں ہوتا ہوں تو نیلی اور سریلی میرے شانوں پر تک کود پھاند کرتی ہیں۔ بینو چتری سے چپکا رہتا ہے۔ ہم تینوں بینو کو پکڑنے کی کوشش کیا کرتے ہیں، میں نیلی اور سریلی۔ وہ دونوں اسے کبھی کبھی گھیر کر میرے پاس لے آتیں ہیں تب میں اسے پیار کرتا ہوں اس کی پیٹھ کھجاتا ہوں، گود میں بٹھاتا ہوں۔ مگر وہ کچھ دیر بعد موقع تلاش کر کے پھر ماں کے پیٹ تلے گھس جاتا ہے۔ میں زیادہ تر انہی کے ساتھ وقت گذارنے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔ کام کا بڑا حصہ گھر پر ہی کرتا ہوں۔ ہم آپس میں باتیں بھی کیا کرتے ہیں۔ باقاعدہ گفتگو ہوا کرتی ہے۔"

شام جی اپنے آخری جملے کا ردِ عمل میرے چہرے پر تلاش کرنے لگے۔

''وہ کیسے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
''یہ تو آپ تب ہی جان پائیں گی جب ذاتی طور پر آپ کو تجربہ ہوگا۔''
شام جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ہال میں داخل ہوتے ہوئے لوگوں میں ہم بھی شامل ہوگئے۔
تیلگو نظم کے مترجم آچکے تھے۔ نظم کا انھوں نے ترجمہ پڑھا تو وہ واقعی شہیدانِ وطن پر لکھی گئی تھی۔
''میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا نا۔'' میرے کان میں سرگوشی ہوئی۔
''جی ہاں'' میں نے زور سے سر ہلا دیا۔
اس کے بعد ایک خاتون نے پنجابی نظم میں، ایک ننھے سے بچے کی شرارتوں کا نقشہ کھینچا۔ میں ممتا بھرے بولوں سے محظوظ ہو رہی تھی اور ہلکے ہلکے سر ہلا کر داد دے رہی تھی۔
''آپ تو نظم میں ایسی کھو گئیں جیسے بچوں کے کسی کھیل میں شریک ہوں۔'' شام جی نے پالتو جانوروں کی سی بو والی سرگوشی کی۔
''تو آپ پنجابی جانتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر اپنے شانے سے کہا۔
''نہیں...... میں نہیں جانتا پنجابی۔'' وہ بولے اور میں پھر خاتون کا کلام سننے میں محو ہوگئی...... آخری نشست برخاست ہونے سے پہلے ہی شام جی معلوم نہیں کب جا چکے تھے۔ مگر مجھے سوچنے کو جانے کیا کیا دے گئے تھے۔
تب سے تین مہینے گذر گئے۔ اب نظر آئے تو بلیوں کی خیریت بتاتے ہوئے کچھ اُداس سے ہوگئے تھے۔
''دراصل میں آجکل پریشان ہوں...... وہ بینو کچھ دنوں سے...... دودھ پیتا ہے نہ کچھ کھاتا ہے۔ میں نے کس قدر کوشش کی جاننے کی مگر اس غریب کی تکلیف سمجھ نہیں پا رہا۔ رات بھر کراہتا رہتا ہے۔ دل گھر میں ہے میرا...... لنچ تک شاید ہی رک پاؤں......''
شام جی افسردگی سے بولے۔
''آپ اسے ڈاکٹر کو دکھایئے نا۔''
''ہاں یہی سوچا ہے۔ آج جاتے ہی یہ کام کروں گا۔''
''پریشان نہ ہوئیے۔ ڈاکٹر اس کی تکلیف ضرور دور کرے گا۔''

شام جی اس کے بعد سارا وقت خاموش خاموش سے رہے۔

دوسری صبح شام جی نظر نہیں آئے...... کہیں بلی کا بچہ...... میں دکھ سے سوچنے لگی...... نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ پھر شام جی کی پچھلی دفعہ والی باتیں...... وہ دلائل......؟

چائے کے وقفے کے دوران، کوئی بارہ بجے کے قریب شام جی دور سے آتے دکھائی دیے۔ سر آگے کو نکالے، بازوؤں کو کہنیوں کے پاس سے اندر کی طرف گھمائے، ہاتھوں کو آدھی بند مٹھیوں کی شکل میں موڑے، مسکراتے ہوئے آرہے ہیں۔

"بینو کیسا ہے شام جی؟" وہ قریب پہنچے تو میں نے پوچھا۔

"اجی کیا بتائیں...... بڑی دلچسپ بات ہے...... ہوا یوں کہ......"

"ایک منٹ ذرا" میں ان کے لئے چائے کا کپ لینے گئی اُس دوران وہ بھی ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بتانے لگے:

"ہوا یوں کہ کل جب میں یہاں سے گیا بینو میری مسہری پر سویا ہوا تھا میری آہٹ پا کر جاگ گیا۔ اور چتری کے پاس جانے کے بجائے میرے قریب آیا۔ میں بیٹھا تو اچھل کر میری گود میں چڑھ گیا۔ اور پھر میرے پاس سے گیا ہی نہیں۔ باہر بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی...... میں نے سوچا تھوڑی دیر بعد لے جاؤنگا اُسے...... ڈاکٹر کے پاس۔ مگر وہ پھر سو گیا—— اور رات بھر میرے ہی پاس بستر میں رہا...... بلکہ رات کو اس نے دودھ بھی پیا—— کچھ تندرست معلوم ہو رہا تھا......"

"چلئے اچھا ہوا" میں نے جیسے کہ سکھ کا سانس لے کر کہا۔

"سنئے نا۔ اچھا تو بعد میں ہوا۔ میں تو۔ میں تو یہ سوچنے لگا تھا کہ——"

شام جی کچھ دیر کو رُکے، پھر بولے:

"میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی میں اس کی تکلیف سمجھنے میں ناکام ہو گیا۔ تو پھر میں...... مگر، آج پھر اس بھولے سے جانور نے میرے خیالات کو مستحکم کر دیا۔ صبح جب میں کپڑے تبدیل کر چکا تو وہ آکر میرے دونوں جوتوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ وہ بیٹھا تو میں بھی مسہری کے کنارے پر بیٹھ گیا کہ شاید وہ میری گود میں آنا چاہتا ہو۔ مگر وہ میری گود میں نہیں آیا۔

میرے دونوں پاؤں کے بیچ میں سے اٹھا اور دونوں پاؤں کے گرد مستطیل کی شکل میں دو

تین چکر لگا کر پھر درمیان لیٹ گیا اور چپ چاپ میری طرف دیکھتا رہا۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر اپنی حرکت کو معنی دینے کی کوشش کرتا ہوا...... کہ اچانک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے دماغ سے ایک خیال ٹکرایا......

مجھے بہت دکھ اور شرمندگی محسوس ہوئی...... میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں...... میں نے اسے اٹھایا گود میں لے کر کوٹ کے اندر رکھ دیا اور کالر کے پاس سے اس کا چھوٹا سا سر میرے دل کے ساتھ لگ گیا۔

مجھے پہلے یہ خیال نہیں آیا کہ...... کہ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور میں خود تو بستر میں سوتا رہا اور ان سب کا بچھونا وہی الماری کا نچلا خانہ تھا اور اوڑھنے کو کچھ بھی نہیں...... مجھے خود پر شرم سی آنے لگی۔ شکر ہے بینو نے مجھے سمجھا دیا ورنہ ان میں سے کسی کو کچھ بھی ہو سکتا تھا مارے سردی کے اور میں خود کو زندگی بھر سوچ سوچ کر سزا میں مبتلا رکھتا۔"

شام جی سر جھکا کر خاموش ہو گئے...... کچھ دیر بعد سر اٹھایا اور مسکرا کر کہنے لگے،

"پھر میں ان کے لیے گودڑ وغیرہ کا بندوبست کرنے گیا۔

ابھی جب میں آرہا تھا تو سب اس کے اندر باہر کود پھاند رہے تھے۔ کبھی لیٹتے کبھی اچھلتے......"

شام جی نے ممتا بھرا قہقہہ فضا میں اُچھال دیا۔ اور لوگ ہماری طرف گردنیں موڑ موڑ کر دیکھنے لگے تو میں نے بھی محبت کی اس پر مسرت زبان میں اپنی ہنسی شامل کر دی۔

□□

("ایوانِ اردو" دہلی، ۲۰۰۰ء)

برآمدہ

"شہلا...... دو کپ چائے لے آنا یہاں اسٹڈی میں"۔ جنید کی آواز دل میں کلی سی چٹخا گئی۔ بس ایک پل کے کسی حصے میں۔ جیسے ہوا سے جھولتے پودے کی شاخ پر جگنو چمک کر گم ہو جائے۔

مگر میرا دل جانتا ہے اور ایمان بھی کہ جنید کے تئیں میری نیت ہمیشہ نیک رہی ہے۔ اور اس بات کی گواہی کے لئے وہ شامیں موجود ہیں جو میں نے سہیل کے گھر میں نہ ہونے کی صورت میں اپنے کمرے کی جالی والی بند کھڑکی سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر باہر برآمدے کی طرف دیکھتے ہوئے تنہا گذار دیں کہ جالی سے لگ کر کھڑے ہونے میں میرے نظر آجانے کا احتمال تھا۔

برآمدہ بہت خوبصورت ہے۔ قوس کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ درمیان میں تین کشادہ سیڑھیاں، سامنے مخملیں گھاس لئے ہوئے بڑا سا باغیچہ کے چاروں کناروں پر گلاب کی کئی قسموں، رنگوں اور جسامتوں کی کیاریاں لگی ہوئی ہیں کہ ہر موسم میں باغیچہ گلوں سے مہکتا رہے۔ باغیچے کے عین درمیان میں کیکر کا چھاتا نما پیڑ اگا ہوا ہے جس کے تنے کے پاس سفید رنگ کے پلاسٹک کی چار چھ کرسیاں اور ایک میز ہر وقت موجود رہتی ہیں۔

سہیل کہتے ہیں کہ باغیچہ میں نے خوب سجایا ہے۔ جنید نے بھی یہی کہا تھا جب کچھ مہینے پہلے وہ آیا تھا۔ وہ پھولوں میں خاصی دلچسپی رکھتا ہے۔ اور پھر گلابوں کی توڑی گئی قلموں کی جگہ پولیتھین بندھا ہوا دیکھ کر یہ اندازہ لگانا آسان بنے کہ باغیچے کی برابر دیکھ بھال ہوا کرتی ہے۔ اصل میں میں نے کئی رنگ کے پھول ایک ہی پودے پر اگائے ہیں۔ ایسا کئی جگہ کیا ہے میں نے، کہیں دو طرح کے پھول کہیں تین طرح کے۔

جنید کو بر آمدے کی سیڑھی پر بیٹھنا بہت پسند ہے۔دن کے کسی بھی پہر۔وہ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کا کراس بنا کر، گھٹنے موڑ کر، دیوار کے کونے سے ٹیک لگا کر، سگریٹ پیتا ہوا، ادھر ادھر دیکھتا ہوا کچھ سوچا کرتا ہے۔یا کبھی دھوئیں کے مرغولے بنا کر باغیچے کی مشرقی دیوار کی طرف پھینکا کرتا ہے۔شاید بے خیالی میں۔

مشرقی دیوار کی دوسری طرف، دوسری منزل کے سفید پینٹ کیے ہوئے بر آمدے کے بیچوں بیچ الگنی پر ایک سفید رنگ کی مہین شفان کا مقیش لگا دوپٹہ اکثر لہراتا ہے۔

میں بھی بے خیالی میں کئی کام کر دیا کرتی ہوں ایک عجیب سی، مستقل سی گھٹن سے پیچھا چھڑانے کے لیے۔ کبھی کچن گارڈن میں گوبھی کے ایک پودے کے پتوں کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ ادھر ادھر ہٹا کر درمیان میں اگ رہے گوبھی کے پھول کا جائزہ لیتی ہوں۔یا کبھی کھیرے کی بیلوں کو سہارا دینے والی لمبی لمبی لکڑیوں کو نکال کر دوبارہ ٹھیک سے گاڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔یا پھر دیوار کے ساتھ ساتھ مستطیل شکل کے چمن میں اُگی اسٹرابیری کی ننھی ننھی کیاریوں کے ہرے ہرے خوبصورت پتوں میں چھپی قرمزی اسٹرابیریاں ڈھونڈا کرتی ہوں یا پھولوں اور سبزیوں پر آتے جاتے پرندوں کا مشاہدہ کرتی ہوں۔ مجھے کچن گارڈن میں مصروف دیکھ کر کبھی کبھی جنید بھی کمرے سے نکل کر میرے آنچل کے کونے میں بندھی اسٹرابیریوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر مسکرایا کرتا ہے۔

آج کل سہیل پھر سے مصروف رہنے لگے ہیں۔ ہمارا رشتہ آٹھ نو برس پرانا ہے۔ابھی سال بھر پہلے تک سہیل...... دو، دو سال کے دو مصروف ترین ادوار کے بعد تیسری دفعہ چار برس تک مستقل مصروف رہنے کے بعد کچھ فارغ ہوئے تھے۔ پہلی بار ہماری شادی کو کچھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ وہ اچانک دفتر میں زیادہ وقت گزارنے لگے۔ میں اپنی نئی نویلی دنیا سنوارنے میں خوش تھی۔ سمجھ لیا کام کی زیادتی ہے۔اپنی پسند کی خوشبو چھڑک کر، پالش کیے جوتوں کو اور زیادہ چمکانے کے خیال سے اپنے دوپٹے کے کنارے سے دو ایک ہاتھ مار کر، آیت الکرسی دم کر کے انھیں وِداع کرتی اور بے فکر ہو کر گھر کی جنت میں جٹ جاتی۔

دو برس بعد معلوم ہوا تھا کہ وہ مصروفیت کسی طویل رخصتی کی خالی جگہ عارضی طور پر پُر ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ میں نت نئے پکوان بنایا کرتی کہ قوت پذیر غذاؤں کے ہمیشہ شوقین رہے ہیں۔ گفتگو کا موضوع عام طور پر غذا ہی ہوا کرتا۔ورنہ وہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتے

میرے اندر بھی خاموشی ٹھہری گئی ہے۔

ادھر پھر کچھ وقت سے وہ پھر مصروف ہو گئے۔ اس دفعہ جم (Gym) میں ہی۔ اب وہ دن میں دو وقت جانے لگے تھے، صبح بھی اور شام بھی۔ کھلی ہوا، بدن اور کسرتیں۔

جانے جم پہنچتے بھی تھے مگر جاتے جم ہی تھے۔ یہ بات بھی عرصہ بعد معلوم ہوئی تھی۔

میں گھر کی ہو گئی تھی اور باہر لے جانے کے لئے ان کے پاس وقت نہ تھا۔

رات گئے گھر آتے۔ میرے بنائے گئے کھانوں کو پسندیدگی سے نوش کرتے۔ میرا وجود رشتے کے تقاضے کا احترام جھیلتا، وہ خوابوں میں محو ہو جاتے۔

خود میں نے دن کے سبھی پہروں میں سے شام کو ہمیشہ سے بہت پسند کیا ہے۔ جب پرندے پُرسکون سے چہچہائیں، جب گھاس اور پتے بھیگ جائیں، جب ہوا میں ہریالی کی خوشبو مل جائے، میں نیم تھکی تھکی کسی دیوار کے سہارے کھڑکی سے آسمان کے کسی حصے میں کسی اکیلے بادل کے ٹکڑے کو تیرتا ہوا دیکھوں اور کوئی پرندہ میرے کان کے پاس سے کچھ کہہ کر پھُر سے گزر جائے۔

مگر اکثر مری شامیں اداس ہوتیں۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ میری شام اگر اداس نہ ہوتی تو شاید مجھے اس درجہ اپنی نہ محسوس ہوتی۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ ہر شام اپنے ساتھ رات لے آتی اور سید ھادل کو چھیدتی ہوئی روح میں اتر جاتی۔ ڈھلتے چاند کی سیاہ، وسوسوں سے بھری تنہارات۔ مگر یوں بظاہر میرے پاس اس خلش کا کوئی جواز نہ تھا۔ جانے خلا کہاں تھا۔

اور دو برس اور گزر گئے۔ یعنی ناطہ ۱۴ برس پرانا ہو گیا تھا سہیل کا دیر سے گھر آنا میں ان کی عادت سے تعبیر کرتی۔ زندگی کچھ تنہا سی گزار رہی تھی میں۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ مجھے محنت اور انتظار نے تھکا دیا تھا۔ چہرہ مرجھا گیا تھا میرا۔

بچپن سے ہی گھر، اور باہر، دونوں جگہ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ قدرت نے مجھے نہایت فراخ دلی سے بنایا ہے۔ مجھے شاید اپنے وجود کے ہر طرح سے مکمل ہونے پر اس قدر اعتماد تھا کہ میں اپنی نام نہاد گھر جنت میں یہ سوچ کر مطمئن رہ سکنے پر بضد تھی کہ انہیں کبھی کوئی صورت بھائے گی ہی نہیں۔

اور اب میں اس موضوع پر سوچ کر اداس رہنے ہی لگی تھی کہ وہ گھر آ گئے۔ پورے تین مہینے کے لئے۔ میں حیرت میں پڑ گئی۔ میں انہیں ایک پیدائشی غیر گھریلو قسم کا لاپرواہ

انسان اور غیر ذمہ دار شوہر سمجھ کر صبر کرنے کی کوشش میں غرق ہوا چاہتی تھی کہ وہ ایک ذمہ دار انسان کی طرح نظر آنے لگے۔ ان تین مہینوں میں میں نے انہیں ایک محبت کرنے والے شوہر کی صورت میں، ایک مخلص ساتھی کی شکل میں پایا۔ میں نے ان کا یہ انداز پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ امیدیں وہ خواب، جو نئی زندگی کے ساتھ، شوہر کی وساطت سے وابستہ تھے اور شادی کے کچھ مہینوں کے اندر ہی اپنی دل آزار تعبیر لئے سامنے آگئے تھے، میں فراموش کر چکی تھی۔

بیا ہتا زندگی کے سکھ کا اتنا ہی سرمایہ ہے میرے پاس۔ وہ تین مہینے۔ اور میں یہ بھی سمجھ گئی کہ سہیل کو ذمہ داریاں سنبھالنا آتی ہیں۔ رشتے نبھانے بھی جانتے ہیں وہ۔

تین مہینے گزر گئے۔

دفتر میں ایک پروجیکٹ پر کچھ کام شروع ہوا۔ کچھ سہیل کو تجربہ کچھ انہیں نئے لوگوں کو کام سکھانا بھاتا بھی تھا۔ وہ کام میں ایسے جٹے، جیسے کام ان کے دفتر کا نہ ہو کر ان کا ذاتی ہو۔ اور وقت پھر سے پرانی رفتار سے گزرنے لگا۔ بلکہ اس دفعہ اس میں کچھ نئی ترمیمات بھی ہونے لگیں۔ یکایک انہیں گھر سے تمام دلچسپیاں ختم ہوگئیں۔ یعنی وہ جو تین مہینے پہلے اچانک پیدا ہوئی تھیں اور اب گھر رات کے ٹھہرنے کے لیے ایک سرائے ہو کر رہ گیا کہ رات کا انتظار ان کے کھانا کھا کر گھر آنے پر ختم ہوتا۔

میں سکون کی وادیوں میں سوئی ہڑبڑا کر جاگ اٹھی۔ ویرانی طبیعت کا مفہوم اچانک میری سمجھ میں آنے لگا۔ خالی پن کا احساس واضح ہو گیا۔ گزشتہ تین مہینے اگر انہوں نے میری زندگی سے متعارف نہ کرائے ہوتے تو میں شاید اس دفعہ بھی اس تبدیلی کو گزشتہ دو تبدیلیوں کی طرح سنجیدہ نہ لیتی۔ کچھ ایسا ہوا تھا جیسے زیست کے بے کراں ریگستان میں اچانک کوئی چشمہ پھوٹ پڑے اور چھوٹی سی ندی کی صورت، رفتار کے ساتھ صحیح سمت میں بہتا ہوا رہبری بھی کرے اور ٹھنڈک بھی پہنچائے، اور اچانک بیچ راستے میں دفعتاً ابلتے لاوے میں تبدیل ہو جائے۔ یا پھر طویل مسافت میں کوئی ہرا بھرا پیڑ کچھ دیر کے لئے اپنی چھاؤں میں لے کر تازہ دم کر دے اور پھر اچانک آگ برسانے لگے۔

میں بے سکون و بے چین ہو اٹھی تھی۔

''آپ بہت دیر سے آتے ہیں آجکل؟'' ایک دن جب وہ مجھے بغور دیکھتے ہوئے کچھ

سوچ رہے تھے تو میں نے ضمناً بات کرنے کے انداز میں سوال کیا تھا۔
"کام بڑھ گیا ہے...... بہت۔" وہ کہیں اور دیکھ کر بولے۔
"رات تک چلتا ہے کیا دفتر آپ کا" میں نے آواز کی لغزش کو جو غصہ دبانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"لوگوں سے ملنا بھی تو پڑتا ہے۔ یہ کیا کام کا حصہ نہیں ہے۔" وہ بے تاثر آواز میں بولے جیسے انہیں معلوم ہو کہ میں یہ سوال کروں گی۔ اور انہوں نے جواب سوچ رکھے ہوں۔ کہ میری آواز کے اس انداز پر بھی وہ پُرسکون رہے۔
میں خاموش ہو گئی۔ میں گھر میں ایسی الجھی یا الجھائی گئی تھی کہ مجھے ان کی باہری دنیا کا کچھ بھی علم نہ تھا۔ کس بوتے پر بحث کرتی ان سے۔
کچھ دن اور بیت گئے۔ شک اور یقین کی جنگ میں، میں پریشان سی رہا کرتی کہ ایک دن ہماری رہائش گاہ کی مغرب کی جانب والے گھر کی ننھی سی بٹیا مجھ سے گلہ کرنے لگی کہ میں کل سہیل کے ساتھ گاڑی میں کہیں جا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ کا میں نے جواب نہ دیا بلکہ اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ میں تو تھی نہیں گاڑی میں۔ گھر سے نکلے دنوں ہو گئے۔
اب سہیل کو مسئلہ حل ہوتا دکھائی نہ دیا تو...... قسموں کا دور شروع ہو گیا اور میں قسموں کو سچا جان کر کچھ وقت بغیر روئے گذارنے میں کامیاب ہو گئی۔
یہ سمجھنے میں مجھے خاصا وقت لگا کہ سہیل اس مہارت سے جھوٹ بولتے تھے کہ دوسرے جھوٹ تک ان پر شک کرنے کا کوئی جواز نظر نہ آتا تھا۔ اور اب سوچتی ہوں کہ اگر انہیں جھوٹ بولنے پر اتنا ملکہ حاصل نہ ہوتا اور میں ان کے جھوٹ کو سچ نہ سمجھتی تو شاید اتنے برس کا تناؤ جھیلنا میرے بس سے باہر تھا۔ وہ سچ کے اندر سے جھوٹ نکال کر اس کامیابی سے پیش کرتے کہ جھوٹ ہی سچ معلوم ہوتا پھر جھوٹ اور سچ کے پھیر میں پڑ کر ایسا کنفیوژن پیدا ہو جاتا کہ ذہن کسی فیصلہ پر نہ پہنچ کر بے قرار بھٹکتا اور اصلیت کی تھاہ کو پانے میں ناکام بھی۔ روح بے درپے داغی جانے والی قسموں کے وار سے نڈھال ہوتی جاتی اور عمر عزیز نکلتی جاتی۔
ایک دن ان کے آفس البم میں کچھ تصویریں دیکھی۔ مختلف تقاریب کی۔ ساتھ ساتھ لگی ہوئی، کئی کئی زاویوں سے لی گئی تصویریں، میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سہیل اگر کسی گناہ میں گرفتار تھے تو یہ یقیناً گناہ بے لذت تھا۔ شکل و صورت میں کوئی بات نہ تھی۔ کسی بھی لباس میں

کوئی جسمانی نقش دکھائی نہ دیتا۔ بازوؤں میں صرف کہنیوں کی ہڈیاں نمایاں تھیں۔ ساڑی میں بدن ایسا معلوم ہوتا جیسے بانس پر کپڑا لپیٹ دیا گیا ہو۔ نوعمری والی بات بھی نہ تھی۔ پھر کیا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ دوست واحباب بھی حیران تھے۔

اور خود یہ بضد کہ محض کام کا تعلق ہے۔ پھر بھی، برسوں..... میری نیند اور بھوک تقریباً ہر روز غائب ہو جاتی۔ اور پھر نئی یقین دہانیوں کے بوجھ سے دب کر میں نڈھال سی ہو جاتی کبھی کھالیتی کبھی تھکن سے چور ہو کر میری آنکھ بھی لگ جاتی۔

اور یوں سوتے جاگتے مرتے جیتے۔ روتے اور اداس ہوتے ہوتے چار برس اور بیت گئے کہ سہیل کو اچانک ٹھہرنا پڑا۔ پروجیکٹ جو مہینوں کا تھا بہر حال برسوں میں مکمل ہوا۔

انہوں نے حالات کے آگے سر جھکایا تو اپنے آپ کو وہیں پایا جہاں سے چلے تھے۔ مگر اس سے انہیں کوئی فرق پڑنے والا نہ تھا کہ سفر وہ منزل تک پہنچنے کے لئے نہیں کرتے تھے۔ خالی الوقت ہو کر الشادہ اپنے آپ کو نئے نویلے سفر کے لئے تیار پاتے۔

آج کل ان کی مصروفیات کی نوعیت بدل گئی ہے۔ گھر جلد آجاتے ہیں سہیل۔ کہتے ہیں آفس میں زیادہ کام نہیں ہوتا۔

دراصل ہماری نئی پڑوسن پر ایک سانحہ گذر گیا ہے۔ اس کا تین برس سے علیل شوہر چل بسا ہے۔ اور وہ اپنی چھوٹی سی بچی لئے اکیلی رہ گئی ہے۔ ہم نے ہمیشہ اچھا ہمسایہ ہونے کی کوشش کی ہے۔ ہم سب کی یہ ہی خواہش تھی کہ فاخرہ کوئی کام وغیرہ کر کے نئی زندگی شروع کرے۔

سہیل بہت کوشش کر رہے ہیں اس کے لئے۔ اصل میں فاخرہ بارہویں جماعت سے آگے نہ پڑھی تھی۔ سہیل نے اسے کمپیوٹر سیکھنے کا مشورہ دیا۔ اس کام کے لئے وہ اسے اپنی گاڑی میں لے جایا کرنے کو بھی تیار ہیں۔ گو کہ اسے کمپیوٹر کلاس کے قریب چھوڑ کر نہیں دوسری طرف سے گھوم کر دفتر کے لئے آنا پڑے گا۔ بہر حال انسان کی مدد کے لئے وہ ان معمولی چیزوں کی کوئی وقعت نہیں دیتے۔ اس نیک کام کے لئے انہیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

فاخرہ کی منّی چار سال کی ہے۔ مگر روتی بہت ہے۔ اسے دن بھر میرے پاس رکھا جاتا ہے۔ سہیل کہتے ہیں کہ فاخرہ کی نوکری لگنے کی دیر ہے کہ منّی بھی سکول جایا کرے گی۔

منّی جنید سے بھی مانوس ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی سے جنید جلد آجایا کرتا ہے۔ پھر منّی کے ساتھ باغیچے میں تتلیاں پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

جنید جب ہنستا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ خاموش پُرسکون باغیچے میں اس کا زندگی سے بھرپور قہقہہ، دیر تک فضا میں گونجتا رہتا ہے۔ تب میں باورچی خانے کی کھڑکی پر آکر باغیچے میں دیکھا کرتی ہوں۔

جنید کالج میں میرا جونیئر تھا۔ وہ میری دوست آرزو کا منگیتر ہے۔ ان کی منگنی نہیں ہوئی ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کا ساتھی ہو جانا خود ہی طے کیا ہے۔ جنید کی پی۔ ایچ۔ ڈی آخری مراحل میں ہے۔ جنید بھی میری طرح سہیل کے پسندیدہ طلباء میں سے تھا۔ جنید اور آروز نے تعلیم جاری رکھی۔ میری سہیل سے شادی ہو گئی۔ پھر راستے الگ ہو گئے۔ جنید اسی شہر میں ہوسٹل میں رہنے لگا آروز اپنے شہر میں پڑھتی رہی۔ اب پڑھانے لگی ہے۔ پچھلے سال جب جنید اس سے ملا تو ان دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ہوسٹل سے جنید کبھی کبھی سہیل سے کچھ علمی مدد لینے آتا رہا ہے۔ اب سہیل نے اسے گھر بلا لیا ہے کہ اب اس کے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے تھیسس داخل کرنے کے لئے۔ جنید سہیل کو بہت مانتا ہے۔ ویسے وہ اچھا ڈرائیور بھی ہے۔ مجھے گھر کی خریداری کے لئے جانا ہوتا ہے تو وہ ساتھ آتا ہے۔ سہیل کے کئی کام بھی کر ڈالتا ہے۔ میں جنید کے ساتھ ہوتی ہوں تو اپنے ہی قہقہوں کی آواز پہچان نہیں پاتی۔ بہت زندہ دل اور ہنس مکھ ہے وہ، مگر میں اس کے سامنے سنجیدہ رہنے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہوں۔ کچھ مہینے بعد جنید چلا جائے گا تو...... پھر......؟ پھر مُنی کس کے ساتھ کھیلے گی۔

ہمارے گھر کی ساخت کچھ اس طرح سے ہوئی ہے کہ شام کے اختتام سے ہی میں چڑھتے اترتے چاند کو ہری ہری گھاس پر چاندنی بکھیرے اپنا منتظر پاتی ہوں۔ جنید اپنے کمرے میں جلدی چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی میز کے بلب کی روشنی دیر تک کھڑکی کے پردوں پر اس کا سایہ بنائے رکھتی ہے۔ جو میں سبزے پر ٹہلتے ٹہلتے دیکھا کرتی ہوں۔

جنید کے کمرے کی روشنی گُل ہونے کے بعد فضا میں چاندنی کے ساتھ ساتھ اداسی بھی واضح ہو جاتی ہے۔ بجھی ہوئی روشنیوں والا گھر اور باغیچے میں تنہا چاندنی دیکھ کر میں کمرے میں آجاتی ہوں۔ ویسے میری خوابگاہ میں مسہری اس زاویے سے رکھی ہے کہ چاندنی زیادہ سے زیادہ دیر تک میرے پاس رہے۔ جب سہیل آتے ہیں تب اکثر تھکی ہاری چاندنی کھڑکی کے ایک کونے پر ٹک کر، کچھ دیر ستانے کے بعد لوٹ جاتی ہے۔

جنید نے چائے کا ایک کپ مانگا۔ میں ابھی نہا کر نکلی ہوں۔ چائے مجھے بھی پینی ہے۔

جبھی تو جنید نے دو کپ کہے ہیں۔ مگر یہ بالوں کا ڈھیر جو میری پیٹھ بھگو رہا ہے، کچھ نچڑ جائے، ذرا ہلکا ہو جائے تو۔ غسل خانے کے آئینے میں، میں نے ابھی ابھی نہا کر اپنا چہرہ دیکھا تھا۔ عرصے بعد کھلا کھلا سا۔ جی چاہتا ہے کہ کسی سے پوچھوں کیا واقعی میں حسین لگ رہی ہوں آج، جیسے پہلے لگا کرتی تھی۔ یا کہ آج ہی میں نے خود کو غور سے دیکھا ہے۔ بہت پہلے سہیل بتایا کرتے تھے، پھر میں سہیل سے پوچھا کرتی تھی...... اب کبھی کبھی فاخرہ بتایا کرتی ہے...... کہ کس لباس میں میں کیسی لگتی ہوں، مگر اب فاخرہ کمپیوٹر کلاسز میں مصروف ہو گئی ہے۔ حوا کی ایک ضرورت مند بیٹی۔

فاخرہ کا قد کچھ چھوٹا ہے، بدن کچھ بھاری۔ بال چھوٹے، گھنے، گھنگریالے۔ کچھ گول مٹول سی، کچھ نرم نرم سی ہے۔ اس کی آنکھیں ادھر ادھر جیسے کچھ تلاش کیا کرتی ہیں۔ فاخرہ ہلکے رنگ پہنتی ہے تو اس کی شخصیت میں وقار آجاتا ہے ورنہ نہیں۔ کبھی کبھی جب فاخرہ کی کلاس نہیں ہوتی تو وہ اور جنید دونوں منّی سے کھیلتے ہیں۔ جنید منّی کو لئے فاخرہ کے وہاں چلا جاتا ہے۔ اور بعد میں فاخرہ منّی کو لینے ہمارے ہاں آجاتی ہے۔ میں باغیچے کی میز پر چائے لگا دیتی ہوں۔ وہ دونوں خوش گپیاں کرتے چائے پیتے تو میں کچھ سنیکس بنا لاتی۔ جنید جب فاخرہ سے باتیں کرتا ہے تو باتوں میں ہی گم ہو جاتا ہے۔

ایک دن جب میں چائے کا پانی کیتلی میں انڈیل رہی تھی تو جنید باغیچے میں فاخرہ کا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ کبھی اس کا ہاتھ دائیں ہاتھ میں لیتا کبھی بائیں میں۔ کبھی ایک ہاتھ پر غور کرتا کبھی دوسرے پر۔ پھر کبھی شرارت سے مسکراتا ہوا اس کی آنکھوں میں دیکھ کر جانے کیا کہتا کہ وہ زور سے ہنس دیتی۔ اس دن ابلتا پانی میرے ہاتھ پر گر گیا تھا۔ میں نے ہاتھ ٹھنڈے پانی کے نل تلے چھوڑ دیا تھا اور کھڑکی سے باہر باغیچے میں دیکھتی رہی تھی۔ جنید فاخرہ کے دونوں ہاتھوں کو الٹ کر دیکھ رہا تھا...... فاخرہ مستقل مسکرا رہی تھی۔

ادھر آرزو جنید کے تصور سے باتیں کر کے مسکرا رہی ہو گی...... مجھ سے جنید نے چائے مانگی ہے...... دو کپ اسٹڈی میں...... یعنی میں بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیوں...... وہ پڑھتے پڑھتے بور بھی تو ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی برآمدے میں آجاتا ہے...... وہاں دونوں ہاتھوں کا کراس بنا کر زینے کی اوپری سیڑھی پر بیٹھ کر سگریٹ پھونکتا ہوا باغیچے کی مشرقی دیوار کی اس طرف دوسری منزل کی بالکنی کو دیکھا کرتا ہے۔ جہاں فاخرہ کے ہلکے ہلکے رنگوں

کے دوپٹے سوکھا کرتے ہیں۔ ہلکے رنگ پہننے کا مشورہ میں نے ہی دیا تھا اسے۔

پچھلے اتوار کو جب فاخرہ اور جنید باغیچے میں منی کے پیچھے دوڑ رہے تھے، تو سہیل اخبار چھوڑ کر باہر آ گئے تھے۔

"تمہارے پاس اتنا وقت ہے کہ تم اس کو یوں ضائع کرو؟" انہوں نے اونچی آواز میں سہیل سے کہا تھا۔

"ذرا منی سے کھیل رہا تھا۔" جنید نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

"فاخرہ تم یا تو اندر آ جاؤ ورنہ جا کر آرام کر لو۔ صبح تازہ دم ہو کر چلنا ہے کلاس میں تا کہ یکسوئی سے کچھ سیکھ سکو۔ اپنے مستقبل کے تئیں ذرا سنجیدہ ہو جاؤ تم۔" سہیل جب یہ باتیں فاخرہ کو سمجھا رہے تھے اس وقت ان کی پیچھے سے جنید نے فاخرہ کو دیکھ کر کچھ اس انداز سے جھک کر آداب کیا تھا کہ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ سہیل کی سمجھ میں نہ آیا کہ انہوں نے ایسا کیا کہہ دیا کہ وہ ہنس رہی ہے۔ پھر وہ یکلخت پیچھے مڑے مگر تب تک جنید اندر جا چکا تھا۔ پھر بھی مجھے سہیل کی آنکھوں میں غصے کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ فاخرہ بھی سر جھکائے منی کو انگلی تھمائے گیٹ کی طرف چل دی۔

دوسری صبح جب سہیل، فاخرہ کو ساتھ بٹھائے جا رہے تھے۔ تو میں گیٹ میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ فاخرہ کو پچھلی سیٹ پر بھی بٹھایا جا سکتا ہے۔ مگر میں سہیل کا جواب جانتی تھی۔ وہ ضرور یہ کہتے کہ میں اس کا ڈرائیور نہیں ہوں۔ شجر ممنوعہ کے ازلی طلبگار۔ میرے ذہن میں یہ جملہ بنا سوچے گونج اٹھتا۔

میں گیٹ بند کر کے اندر آ گئی اور عشق پیچاں کی بیل کے پاس سوکھ کر گرے ہوئے پھول چننے لگی۔ کچھ دیر بعد جنید لباس تبدیل کیے میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ یونیورسٹی جانے والا تھا۔

"غلام کو بھی کبھی خدمت کا موقع عطا فرمایا کریں۔ آخر یہ چھ فٹ کا جن کس دن کام آئے گا۔ میرے آقا۔ آپ اپنا لباس خراب نہ کریں۔ مجھے حکم دیں۔" وہ کسی فلمی جن کی طرح ادب سے سر جھکائے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"اس کام کے لئے طویل قامت کی نہیں کسی کوتاہ قد کی ضرورت ہے۔ جو یہاں کیاریوں کے پیچھے آسانی سے سما جائے۔" میں نے مشرقی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''آپ بھی کمال کرتی ہیں شہلا۔ وہاں تو ساری کی ساری خوبصورتی آپ کے پاؤں جتنی بھی نہیں ہے'' اس نے جھک کر میرا داہنا پاؤں چھو کر کہا۔ میں نے اس کے ایستادہ ہونے سے پہلے اس کے بال خراب کر دیئے۔ اس نے انہیں دوبارہ انگلیوں سے کنگھا کر کے سر کو ایک خاص انداز سے جھٹک کر سنوار دیا۔

''سہیل صاحب سے کہیئے گا کہ ان کی اجازت ہو تو میں کل سے فاخرہ کو اپنے سکوٹر پر کلاس چھوڑ دیا کروں۔ میرے تو راستے میں ہے۔ اور پھر کچھ پڑوس کا حق بھی تو ادا کرنا چاہئے۔ کچھ ثواب میں بھی تو کما لوں۔'' وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔

''خود کہنے میں ڈر لگتا ہے کیا۔'' میں نے شرارت سے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔ اور ہاتھ لہرا کر بائے کہتا ہوا چلا گیا۔

اس دن میں دن بھر سوچتی رہی .... اب جنید بھی ......

جنید نے چائے منگوائی ہے۔ وہ پڑھتے پڑھتے تھک گیا ہو گا۔ اس نے قلم رکھ کر سر کے بال دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے رگڑ کر بکھیر دیئے ہوں گے۔ اور ایک ہاتھ کے انگوٹھے اور لمبی انگلی کو دونوں آنکھوں کے باہری کونوں سے اندر کی طرف لا کر ناک کی جلد چٹکی میں بھر کر چھوڑ دی ہو گی۔ اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں ہوں گی۔ اس کی قمیض کا اوپر کا بٹن کھلا رہتا ہے۔ پنکھے کی ہوا سے اس کے گریبان میں سے سیاہ بال لہراتے ہوئے نظر آ رہے ہوں گے۔ کچھ پل بعد وہ سگریٹ جلا کر کھڑکی سے باہر دیکھے گا۔ اس نے کرسی کا رخ مشرق کی جانب کر رکھا ہے۔

میں نے چائے بنائی ہے۔ دو کپ چائے ٹرے میں سجا کر گیلری سے گزرتے ہوئے میں نے دیوار میں لگے بڑے سے آئینے میں اپنے سراپے کو ترچھی نظر سے دیکھ ڈالا۔ ہرے لباس میں، میں سدا بہار پودے کی شاخ لگ رہی ہوں۔

جنید سے کہوں گی کہ اگر وہ کرسی کی پشت مشرق کی طرف کر دے تو گیلری میں لگے آئینے میں سے میں اسے باورچی خانے میں دکھائی دیا کروں گی۔ پھر اسے چائے کے لئے آواز نہیں لگانا پڑے گی۔ صرف اشارہ کرنا ہو گا۔ مجھے جنید کا یوں سگریٹ پی کر دھوئیں کے دائرے باہر پھینکنا ذرا بھی پسند نہیں ...... پتہ نہیں مجھے زیادہ کون سی بات ناپسند ہے ان دونوں میں سے۔ بہرحال وہ میری بات نہیں ٹالے گا۔ اور کرسی کو میز کے سامنے سے اٹھا کر میز کی

دوسری طرف رکھ دے گا۔ ورنہ...... ورنہ میں آرزو کو کیا جواب دوں گی......

جب میں چائے کی کشتی لیکر کمرے میں داخل ہونے لگی تو تو وہ بڑی محویت سے کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اور دھوئیں کے دائرے بنابنا کر باہر کی طرف اڑاتے ہوئے ہلکے ہلکے مسکرا رہا تھا...... یعنی بالکنی میں......

کچھ دیر دروازے پر رک کر میں کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے میری آمد کا علم نہیں ہوا تھا۔ اور میں ذرا سی دیر میں سمجھ گئی کہ اس کے سگریٹ نوشی کرنے اور دھواں کھڑکی سے باہر پھینکنے میں سے مجھے کون سی بات ناپسند ہے۔

میں نے اسے متوجہ کرنے کے لئے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اور میز تک چلی گئی۔ چائے کی کشتی میز پر رکھ دی۔ لگاتار اس کی طرف دیکھتے ہوئے اور بغیر باہر کی طرف گردن موڑے میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھٹ سے بند کر دیئے اور باہیں پھیلا کر کھڑکی کے سامنے تن گئی۔

"اگر تمہیں کھڑکی کھولنی ہے تو آکر مجھے یہاں سے ہٹالو۔" میں نے جنید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر کہا......

اس نے سلگتی ہوئی سگریٹ، ایش ٹرے کے کونے پر ٹکا دی اور جب وہ آنکھوں میں شرارتیں لئے کرسی سے اٹھنے لگا تو پل بھر کو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ مگر اگلا لمحہ ضائع کیے بغیر میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔

جلدی سے زینہ طے کر کے اپنی خوابگاہ کی پناہوں میں پہنچتے ہوئے میں یہ سوچ رہی تھی کہ...... آرزو کو تو کوئی نہ کوئی جواب مل ہی جائے گا۔

اور خود مجھ کو......؟

❑❑

("ایوانِ ادب" نئی دہلی، ۲۰۰۰ء)

شہر

پلاسٹک کی میز پر چڑھ کر سونو نے نعمت خانے کی الماری کا چھوٹا سا کواڑ وا کیا تو اندر قسم قسم کے بسکٹ، نمک پارے، شکر پارے اور جانے کیا کیا نعمتیں رکھی تھیں۔ پل بھر کو وہ ننھے سے دل پر کچوکے لگاتا ہوا غم بھول کر مسکرا دیا۔ اور نائٹ سوٹ کی لمبی آستین سے سوکھے ہوئے آنسوؤں بھرے رخسار پر ایک اور تازہ بہا ہوا آنسو کو پونچھ کر اس نے بسکٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لے لیا اور اپنے پانچ سالہ وجود کا بوجھ سنبھالتا ہوا میز سے نیچے اتر آیا۔ اسے بھوک بھی بہت لگی تھی۔ آج صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا، اس کی چھوٹی سی اڑھائی برس کی بہن ثوبیہ بھی صبح سے بھوکی تھی۔ سارا دن وہ مسہری پر لیٹی اپنی ممی کو پکار پکار کر تھک گئی تھی۔ اور بہت زیادہ روتے رہنے کے باعث نڈھال سی ہو کر اس نے اپنا گھنگھریالے بالوں والا ننھا سا سر اپنی امی کے پھیلے ہوئے بازو پر رکھ چھوڑا تھا...... دن بھر شاید وہ سوتی رہی تھی اور کچھ دیر پہلے ہی اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

اس شہر میں آئے اُنہیں صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔

امان کو بہت عرصے سے اس شہر میں اپنی تبدیلی کروانے کی خواہش تھی لیکن اس میں بس ایک ہی پریشانی تھی کہ رہائش کا انتظام نہایت مشکل کام تھا۔ اُس کے قصبے کے انوار صاحب بھی اسی کمپنی میں کام کرتے تھے مگر وہ ہیڈ آفس سے وابستہ تھے اور شہر میں رہائش پذیر تھے۔ رہائش بھی کمپنی کی طرف سے ملی ہوئی تھی کیونکہ وہ پچیس برس سے اسی دفتر میں تھے۔ اُن کے بعد آنے والے ملازمین میں سے بہت کم کو فلیٹ میسّر آیا۔ غیر شادی شدہ لوگ تو ایک کمرے والی سکونت میں دو، یا تین تین کے حساب سے ہوسٹل کی طرح کمرہ بانٹ لیتے تھے مگر فیملی والے ارکان کے لیے یہ مسئلہ سب سے پیچیدہ تھا۔

امان اپنے قصبے میں کمپنی کا برانچ منیجر تھا۔ انوار صاحب ہر تین ماہ کے بعد اپنی کمپنی کا کوئی کام نکال کر اپنے آبائی گھر آتے۔ بزرگ والدین سے ملاقات بھی ہو جاتی اور کمپنی کا کام بھی بنا لیتے۔

اس بار انوار صاحب اپنے ساتھ امان کے لیے کچھ سپنے بھی لے آئے تھے۔ بڑے شہر میں رہنے کے، بچوں کو بڑے بڑے سکولوں میں تعلیم دلوانے کے اور ہیڈ آفس میں رہ کر ترقی کے نئے راستے وا ہونے کے۔

وہ ریٹائرمینٹ لے رہے تھے اور امان کے لیے ٹرانسفر کی بات بھی کر آئے تھے۔

امان اگر بروقت نہ پہنچتا تو اُسے اور کچھ برس انتظار کرنا پڑتا اور فیملی فلیٹ اُسے جب ہی ملتا جب فیملی ساتھ ہوتی ورنہ اُسے بیچلر رومز میں رہنا تھا۔ انوار صاحب نے فلیٹ کی چابی ابھی دفتر میں جمع نہیں کرائی تھی۔ وہ یہ کام امان کی موجودگی میں کرانا چاہتے تھے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر اُن کی عزت کرتے تھے، اُنہیں یقین تھا کہ وہ اُن کی بات مان لیں گے۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا آنے کی کوشش کرتا وہ کسی کی علیت سے پیشتر امان کے حق میں فیصلہ کروانا چاہتے تھے۔

امان نے دو دن کے اندر ساری تیاریاں مکمل کرلیں اور مع بابرا اور بچوں کے شہر روانہ ہو گیا۔

انوار صاحب کا فلیٹ ۱۴ منزلہ عمارت کا سب سے اوپری فلیٹ تھا۔ عمارت کی ہر منزل پر تین تین فلیٹ تھے مگر سب سے اوپر والی منزل میں یہی ایک فلیٹ تھا۔ کیونکہ ایک طرف ڈش انٹینا تھا اور دوسری طرف پانی کی ٹنکیاں۔ درمیان میں یہ ایک فلیٹ ہی بن پایا تھا۔ اس کے اوپر بڑا سا کشادہ ٹیرس تھا جس میں تقریبات وغیرہ ہوا کرتیں۔ وہاں سے نیچے دیکھنے پر سارا شہر دلہن کے ستارے لگے آنچل کی طرح نظر آتا۔

اس سے نیچے کے تین فلیٹس میں سے دو آباد تھے اور ایک پر کچھ تنازع چل رہا تھا۔ ایک فلیٹ کے مکین کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ایک میں امان کی ہی کمپنی میں کام کرنے والے وکرم بھسین رہتے تھے۔

بابرا کو فلیٹ اور امان کو شہر بہت پسند آیا۔ فلیٹ کشادہ تھا۔ تین خوابگاہوں، ڈرائنگ روم اور باورچی خانے پر مشتمل۔ ہر کمرے کے ساتھ ملحقہ غسل خانہ، اور لباس بدلنے کے لیے چھوٹا سا احاطہ۔ اونچی چھتیں، بڑی بڑی کھڑکیاں، لمبے لمبے دروازے۔ تین دن میں فلیٹ سج گیا۔ ضرورت کا سامان آگیا سوائے ٹیلیفون کے۔ ٹیلیفون کی فیس پچھلے تین ماہ سے ادا نہیں ہوئی تھی اور ان مہربانیوں کے بدلے امان کو انوار صاحب کے لیے اتنا تو کرنا ہی تھا۔ ورنہ

خواہ مخواہ انوار صاحب کی گریجویٹی وغیرہ متاثر ہوتی۔ بلکہ امان کو تو کئی مہینے کا بجلی کا بل بھی بھرنا پڑا تھا جب جا کر بجلی کا کنکشن دوبارہ جوڑا گیا۔ ٹیلیفون کا بل ادا کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ امان نے پہلے دن آفس جوائن کرنے کے بعد دوبارہ آفس کا رخ تک نہیں کیا تھا کہ بغیر بجلی کے اس شہر میں ایک دن کے لیے بھی رہنا مشکل تھا اور سارا وقت اُسے ادھر اُدھر بھٹکنا پڑا تھا۔

کوئی پانچویں دن امان دفتر گیا کہ بھسین صاحب کے فلیٹ میں اُس کے لیے فون آیا تھا۔ اُسے سائٹ پر جانا تھا اور واپسی دوسرے دن کی تھی۔ وہاں کچھ ایسا کام پڑ گیا کہ امان دوسرے دن نہ آ سکا۔

صبح دروازے کی گھنٹی بجی تھی تو سونو کی آنکھ اسی آواز سے کھل گئی تھی۔ ممّی اور ثوبیہ سو رہی تھیں۔ سونو دروازے تک گیا اور اس نے دروازے کی نچلی چٹخنی بھی کھولی تھی مگر میز پر کھڑے ہونے کے باوجود اُس کا ہاتھ دروازے کے اوپر والی چٹخنی تک نہ پہنچ سکا۔

"جی کون ہے؟" اُس نے پکارا بھی تھا مگر باہر سے کوئی جواب نہ آیا۔ آنے والے نے شاید اُس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اور دروازہ نہ کھلنے پر لوٹ گیا تھا۔

"ممی۔ کوئی گھنٹی بجا رہا ہے۔ ممّی...... ممّی۔" اُس نے کئی بار ممی کو پکارا تھا مگر ممی جانے آج کیسی نیند سو رہی تھیں۔ جاگ ہی نہیں رہی تھیں۔

"ممی...... ممی جی...... کوئی دروازے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔" اُس نے اونچی آواز میں پکارا تو ثوبیہ نے ابروؤں کے رُخ پر خمیدہ پلکوں والی مُنی مُنی آنکھیں کھول دیں۔ اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں جھپک جھپک کر ادھر اُدھر دیکھا اور بھائی کو ممی پکارتے سن کر خود بھی ممی ممی پکارنا شروع کر دیا۔

مگر ممی بول ہی نہیں رہی تھیں۔ ممّی کے دہانے کے چاروں طرف کوئی سفید سی چیز جمی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی کچھ عجیب طرح سے پھیلے ہوئے تھے۔

ثوبیہ نے ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر رونا شروع کر دیا۔

"چپ ہو جانا۔ روتی کیوں ہے۔" سونو نے جھلا کر کہا تو ثوبیہ اور زور زور سے رونے لگی۔

"ممی سو رہی ہیں ثوبی۔" وہ بہن کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔

"ممّی۔ ممّی۔ اُٹھیے نا۔" سونو پھر ماں کو جگانے کی کوشش کی جب تک دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی۔

"کون ہے...... "وہ دروازے کے قریب جاکر اور اونچی آواز میں بولا۔کوئی جواب نہ آیا۔

وہ واپس کمرے میں آیا۔ ثوبیہ باقاعدہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ سونو کچھ دیر ماں کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر روتی ہوئی بہن کو بغور دیکھنے لگا۔

"ممّی "اُس نے ممی کو پوری طاقت سے جھنجھوڑا مگر ممّی بے حس و حرکت پڑی رہیں۔

وہ کچھ دیر گُم سُم سا بیٹھا رہا۔ پھر ثوبیہ کے قریب جاکر اُس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اُس کے آنسو پونچھے۔

"نہیں رونا ثوبی۔ ممّی سورہی ہیں۔ "مگر ثوبی تھی کہ چپ ہی نہیں ہورہی تھی۔

"چپ ہو جا۔ "وہ چیخا اور ساتھ ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

جانے کب تک دونوں بہن بھائی روتے رہے مگر امی نے چپ ہی کرایا نہ کچھ بولیں۔

ثوبیہ کوئی گھنٹہ بھر روتی رہی۔ پھر تھک کر سو گئی۔

وہ سو گئی تو سونو پھر ماں کے قریب گیا۔ اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر دائیں بائیں ہلانے لگا۔

"ممی "اس نے زور زور سے ممی کا سر ہلایا "ممّی...... ممّی جی۔"اس نے آنسوؤں میں بھیگی آواز میں محبت گھول کر پکارا۔ ممی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر وہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ پردہ سرکا کر کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔

سامنے ایک بڑا سا پارک تھا جس میں چھوٹے چھوٹے کھلونوں جیسے رنگ برنگے بچے کھیل رہے تھے۔ پارک میں کئی طرح کے چھوٹے بڑے جھولے لگے ہوئے تھے ادھر اُدھر آئس کریم اور ویفرس کے پیکٹ والے اپنی چھوٹی چھوٹی ہاتھ گاڑیاں لیے ہوئے گھوم رہے تھے ایک ریڑھی پر نہایت ننھی ننھی بوتلوں میں کولڈ ڈرنکس سجی ہوئی تھیں پارک کے دوسرے جانب لمبی سی سڑک پر چھوٹی چھوٹی بے شمار گاڑیاں بھاگ رہیں تھیں۔ سونو نے یہ ساری چیزیں اس قدر چھوٹی جسامت میں آج سے پہلے کبھی نہ دیکھیں تھیں۔ اُس کے ذہن میں عجیب عجیب سوال اور خیال اُبھرنے لگے۔ وہ کمرے میں لوٹ آیا۔

"ممی جی۔"اُس کے ننھے سے سینے سے درد بھری کراہ نکلی۔ اور اُس نے اپنا چھوٹا سا سر ممی کے سینے پر رکھ دیا اور دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔ اُس کے آنسوؤں سے ممی کے شب

خوابی کے لباس کا گریبان بھیگ گیا مگر ممی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ رو رو کر جب وہ ہلکان ہو گیا تو جانے کب اسے نیند آ گئی۔

جانے کتنا وقت وہ سوتا رہا۔

"چھو چھو" نیند میں اس کے کانوں میں ثوبیہ کی آواز پڑی تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

"چھو چھو" ثوبیہ نے ممی کی طرف سے نظر ہٹا کر بھائی کو دیکھ کر کہا۔

"سو سو کرنا ہے" سونو نے پوچھا تو اُس نے چھوٹا سا سر ہلا دیا۔ سونو نے غسل خانے کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔

باہر شام ہو چلی تھی۔

ثوبیہ باتھ روم سے آکر ماں کے پاس لیٹ گئی۔

"ممّی...... مم...... ممّی" ثوبیہ نے اپنی شہادت کی اُنگلی سے ماں کی آنکھ کھولنے کی کوشش کی...... وہ ناکام ہو کر پھر رونے لگی

ممی ی ی...... "وہ ممی کو پکارتی ہوئی ہچکیاں لینے لگی۔

سونو بہن کو بے بسی سے دیکھتا رہا۔

"ممی اُٹھئے نا...... ممی جی...... ثوبی رو رہی ہے۔ اُسے بھوک لگی ہے۔"

وہ گلوگیر آواز میں ماں سے مخاطب ہوا...... اُسے خود بھی بھوک لگی تھی مگر جب تک اُس نے ثوبیہ کی بھوک کا ذکر نہ کیا اس طرف اُس کا خیال نہ گیا تھا۔

اب اُسے بھوک کا احساس ہونے لگا۔

وہ ماں کے پاس سے اُٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ تمام برتن دھلے دھلائے رکھے تھے۔ کسی میں کچھ کھانے کو نہ تھا۔

اُس نے فرج کھولا...... اُس میں سیب رکھے تھے...... وہ دو سیب اُٹھا کر کمرے میں آ گیا۔

ایک سیب کو خود کترنے لگا اور دوسرا ثوبیہ کو پکڑوایا۔ ثوبیہ اُسے کھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اُس کے منہ میں اُگے آٹھ دانت سیب کے سخت چھلکے کے ساتھ انصاف نہ کر سکے اور وہ محض سیب کی سطح پر ایک آدھ نشان لگا کر رہ گئی اور چپ چاپ بھائی کو دیکھنے لگی۔ سونو نے سیب کا ایک ٹکڑا توڑ کر دیا تو وہ اُسے چبانے کی کوشش میں ادھر اُدھر گھماتی رہی اور

آخر کار نگل گئی۔

دونوں سیب ختم ہو گئے تو سونو فرج میں پڑا آخری سیب اُٹھا لایا...... کچھ دیر دونوں سیب پر زور آزمائی کرتے رہے۔ اس سے فارغ ہو کر پھر ممی کو جگانے کی کوشش کرنے لگے۔

ممی کچھ نہ بولی تو دونوں رو رو کر ممی کو ہلانے لگے۔ گھر میں اتنی گرمی تھی مگر ممی کا بدن ایکدم ٹھنڈا پڑا ہوا تھا...... پتہ نہیں کیوں...... پھر کسی وقت اُنہیں نیند آ گئی......

دوسری صبح بھی ممی نہیں اُٹھیں...... دروازے کی گھنٹی دو بار بجی تھی۔ جس سے سونو جاگ گیا تھا۔

"جی...... ی ی...... کون ہے۔" کوئی جواب نہ آیا...... شاید مضبوط دیواروں اور بھاری دروازے کے اُس پار اُس کی معصوم سی کمزور آواز پہنچ نہیں پائی تھی اور آنے والا پھر لوٹ گیا تھا۔

ثوبیہ نے جاگتے ہی رونا شروع کر دیا تھا۔ اور ممی کے پاس جا کر زور زور سے چیختے ہوئے رو رو کر جب مایوس ہو گئی تو ہچکیاں لیتی ہوئی باہر آ گئی......

اُس کا پھول سا چہرہ کھملا گیا تھا۔

باورچی خانے میں سونو فرج کھولے بغور اندر دیکھ رہا تھا۔ پرسوں کا پڑا ہوا دودھ پھٹ چکا تھا۔ ثوبیہ کو قریب دیکھ کر اُس نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"دُودُو پیئے گی۔" اُس نے ممی کی طرح پوچھا تھا۔

"ہوُں۔" وہ زور زور سے سر ہلا کر بولی۔

اُس نے پھٹا ہوا دُودھ چمچ سے ثوبیہ کے فیڈر میں ڈالنے کی کوشش میں بہت سارا دودھ گرا کر تھوڑا سا ڈالنے میں کامیابی حاصل کر لی تو فیڈر بہن کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں تھما دیا۔

ثوبیہ وہیں فرش پر چت لیٹ کر دودھ پینے لگی۔ جب پھٹے ہوئے دودھ کا کوئی ٹکڑا نپل کے چھید کو بند کرنے لگتا تو وہ پیر پٹخ پٹخ کر پوری طاقت سے نپل کو چوسنے لگتی اور رونے لگتی...... پھر چپ ہو جاتی۔

سونو نے دودھ کے کچھ بچے ہوئے چمچ خود بھی پیے اور ثوبیہ کے پاس جا بیٹھا...... بوتل خالی ہوئی تو ثوبیہ اُٹھ کر بیٹھ گئی...... پھر کھڑی ہو کر ممی ممی پکارتی ہوئی خوابگاہ میں چلی گئی۔

سونو بھی کمرے میں آ گیا۔ اور کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑا ہو کر ماں کو دیکھنے

لگا۔ ممی کی شکل آج اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

مسز بھسین کی جذوقتی ملازمہ صبح اوپر آئی تھی تو کسی نے دروازہ نہیں کھولا تھا......
دراصل اماں نے اُن کے ہاں فون کیا تھا کہ بابرا کو بتادیں وہ ایک دن اور رُک گیا ہے اور کل آجائے گا۔ کہ بابرا بہت جلد گھبرا جاتی ہے...... ملازمہ سے دروازہ نہ کھلنے کی خبر سن کر مسز بھسین نے سوچا تھا کہ پڑوسی کہیں گھومنے گئے ہوں گے۔ یا شاید سو رہے ہوں۔ یا جو بھی......

"ثوبی! آجا اندر بیٹھیں۔" سونو نے ثوبیہ سے کہا۔

"کھڑکی سے باہر دیکھیں گے۔" وہ سر اوپر سے نیچے کی طرف ہلا کر بولا۔

"نہیں...... ممی پاش...... "وہ جھٹکے سے نفی میں سر ہلا کر بولی......

"ممی تو بولتی ہیں نہیں...... تو میرے پاس آجا۔" وہ اداس سا ہو کر بولا۔ اس کا چہرہ آج پیلا نظر آرہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں......

"آنا ثوبی...... آجا۔" وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگا...... ثوبیہ ماں کے پھیلے ہوئے بازو پر سر رکھے اپنا منا سا انگوٹھا چوستی رہی اور چھوٹا سا سر نفی میں ہلا ہلا کر بھائی کو دیکھتی رہی......

سونو اس کے قریب جا کر اسے اٹھانے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ ممی کے پاس سے خراب سی بو آرہی تھی۔ ممی نہائی نہیں ناکل سے...... کپڑے بھی نہیں بدلے...... ہم بھی نہیں نہائے...... اس نے اپنا گریبان سونگھا...... وہاں اسے پرسوں کے لگائے ہوئے بے بی پاوڈر کی ہلکی سی مہک آئی...... اس نے پھر ممی کی طرف دیکھا...... ممی کی شکل بدلی بدلی سی لگ رہی تھی...... وہ آہستہ آہستہ ایک دو الٹے قدم اٹھاتا ہوا دیوار سے لگ گیا...... اس کی نظریں ماں کے چہرے پر گڑھی تھیں...... وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کمرے کے دوسرے کونے میں پہنچ گیا...... اور دیوار سے پھسلتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں عجیب قسم کا خوف سا چھا رہا تھا۔ اسے نیند سی بھی آرہی تھی۔ مگر وہ پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا۔ آنکھ لگنے لگتی تو فوراً آنکھیں کھول کر ماں کے چہرے کو دیکھنے لگتا...... دور بیٹھا ہوا...... وہاں سے ماں کے تلوے نظر آرہے تھے اور پھر ماں کا باقی جسم۔ بعد میں چہرہ...... ٹھوڑی سے شروع ہوتا ہوا۔ اس کا ننھا سا دل دھک دھک کر رہا تھا اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھ دیے۔ اور...... پھر پتا نہیں کب وہ دیوار سے لگا لگا فرش

پر آ گیا۔ اس کے گھٹنے اس کے سینے سے لگے ہوئے تھے اور وہ سو چکا تھا۔

صبح پھر دروازے کی کال بیل لگاتار کچھ پل بجی تو وہی بیدار ہوا۔ دروازے تک گیا اور بے چارگی سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ منٹ بعد لوٹ آیا...... گھر میں ہوتا تو کھڑکی سے نانی کو آواز لگاتا۔ یہاں تو نہ وہ دروازہ کھول سکتا تھا نہ کھڑکی۔ کھڑکی کھول بھی لیتا تو اس کی آواز کون سن پاتا کہ کھڑکی سے نظر آنے والے لوگ اس کی آواز کی رسائی سے بہت دور تھے......

آج ثوبیہ ابھی تک سو رہی تھی وہ دروازے پر ٹھہر کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ ماں کا چہرہ بغیر پانی کے گلدان میں پڑے کئی دن پرانے پھول سا لگ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ماں کے کچھ قریب جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ ممی کی شکل بدل گئی تھی یہ شکل کسی اور کی تھی۔ میلے سے مٹیالے چہرے والی...... اس کی ممی تو گوری تھی...... تو کیا یہ اس کی ممی نہیں تھی...... تو کیا اس کی ممی کی شکل کو کچھ ہو گیا ہے...... یا...... یا یہ کوئی اور ہے۔ کوئی عجیب سی شے...... انسان جیسی کوئی شے......

ذہن میں اس خیال کے آتے ہی وہ زور سے چیخ پڑا۔ ثوبیہ نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور رونے لگی۔ وہ چیختا ہوا کمرے سے باہر بھاگا اور ڈرائنگ روم کے لمبے صوفے کے عقب میں جا چھپا۔ اس کا چھوٹا سا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔ ثوبیہ کچھ دیر روتی رہی پھر اٹھ کر بھائی کو ڈھونڈنے لگی۔

''بیا۔ بیا'' وہ باورچی خانے میں گئی اور روتے روتے بھائی کو پکارنے لگی۔ وہاں بھائی کو نہ پا کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''بیا۔ آ۔ آ'' اس نے نحیف سی آواز میں پکارا

سونو صوفے کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے خوفزدہ دل میں احساس ذمہ داری نے قوت بھر دی۔ بہن کو دیکھ اس کے قریب چلا گیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی ثوبی کو بہت تیز بخار ہے۔

''بیا۔ پانی'' وہ ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔

''تجھے بخار ہے...... آ جا۔ ادھر لیٹ جا...... میں پانی لاتا ہوں۔''

اس نے صوفے پر چڑھنے میں بہن کی مدد کی اور باورچی خانے کی طرف گیا۔ خوابگاہ

کے قریب سے گذرتے وقت اس نے ایک ادھوری سی نظر کمرے کی طرف تیزی سے ڈالی اور فرج کے پاس چلا گیا۔ فرج میں سے بوتل نکال کر اسے گلاس میں انڈیلنے لگا۔ ساری بوتل خالی کر کے ہی کہیں گلاس بھر سکا۔

گلاس اور چمچہ لیے وہ بہن کے پاس آگیا اور اسے دھیرے دھیرے پانی پلانے لگا۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ چمچ وہ خود بھی پیتا رہا۔

"بھوک لگی ہے؟" اس نے نہایت محبت سے ثوبیہ سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

صبح جب دروازے کی گھنٹی سن کر سونو بے بسی سے پلٹ آیا تھا اس وقت مسٹر بھسین کے ہاں پھر امان نے ٹیلی فون کیا تھا۔ اور پھر مسز بھسین نے اپنی جذوقتی ملازمہ کو اوپر روانہ کیا تھا جو لگاتار تین چار گھنٹیاں بجا کر لوٹ آئی تھی۔

ثوبیہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر نڈھال پڑی تھی۔

سونو ذمہ دار بھائی کی طرح اس کے قریب بیٹھا تھا۔ بیچ بیچ میں دونوں اونگھ لیتے...... شاید مسلسل نقاہت یارات بھر گھٹی ہوئی آلودہ فضا میں رہنے کے باعث۔

کبھی کبھی سونو سر گھما کر چور نظروں سے بیڈ روم کی طرف دیکھتا اور جلدی سے چہرہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ وقفے وقفے سے اس کے آنسو بہہ نکلتے تھے۔

اس بار ثوبیہ جاگی تو پھر رونے لگی۔

"دودھ پیئے گی ثوبی۔؟" اس نے آواز میں پیار بھر کر کہا۔

"مگر دودھ تو ہے ہی نہیں۔ اچھا ٹھہر جا میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔" ثوبیہ نے کچھ نہ کہا اسے خود بھی بہت بھوک لگ رہی تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باورچی خانے کی طرف گیا اور پلاسٹک کی میز کھینچ کر نعمت خانے کی الماری کے ٹھیک نیچے تک لے گیا۔

بسکٹ کا ڈبہ لے کر جب وہ خوابگاہ کے باہر سے گذرا تو اس نے بے اختیار سا ہو کر اندر نگاہ دوڑائی حالانکہ وہ وہاں سے سیدھا ڈرائنگ روم میں بھاگ آنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے پتہ تھا اندر اس کی می نہیں۔ پتہ نہیں کون ہے اور کیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ بیڈ پر پڑی ہوئی می جیسی کوئی چیز جیسے دب کر پھیل گئی ہے۔ بند آنکھیں جیسے بڑے بڑے ابھرے ہوئے

دائروں میں دھنسی پڑی تھیں۔اس چیز کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ جانے کس رنگ کے تھے...
دوسرے ہی پل اس نے منہ دوسری طرف موڑا اور پوری طاقت لگا کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔اس کا چہرہ خوف سے سفید ہو گیا تھا۔بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

شاید وہ ایک زوردار چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتا مگر بخار میں چپ چاپ لیٹی ہوئی بہن نے اس کے حواس کو قابو میں رکھا۔چیخ اس کے ننھے سے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔

وہ بہن کے قریب چلا گیا اور باچھیں کھول کر مسکرانے لگا تو اس کے سوکھے سوکھے لب پیلے ہو رہے تھے۔

"بسکٹ۔لایا۔ہوں" وہ تھر تھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"کھائے گی۔" وہ پیار سے پوچھنے لگا۔اور ثوبیہ ٹکر ٹکر بھائی کو دیکھتی رہی۔

❑❑

("آجکل اردو" نئی دہلی،۲۰۰۰ء،
"آجکل ہندی" ۲۰۰۰ء، نئی دہلی
"شعر و سخن" مانسہرا)
ماہنامہ سمر سیر...۲۰۰۰

بجھائے نہ بنے

ریشماں کو بجھا بجھا سا دیکھ کر میرے اندر اداسی کی ایک لہر سرایئیت کر گئی۔ اب کیوں اداس ہے وہ...... یہ بات میں بس سوچ کر رہ گئی۔ کیونکہ میرے نزدیک اب اس کے سارے مسئلے حل ہو گئے تھے۔ طوفان گذر چکا تھا کوئی نیا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ پھر یہ بیماروں سی حالت۔ یہ غمزہ تاثرات؟

کوئی ہفتہ بھر پہلے ریشماں کو شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سب کی نگاہوں میں رسوا ہوتے ہوتے بچی تھی وہ۔ سامنے والے پارک کے کونے والے گھر کے باہر ایک تماشا سا ہو رہا تھا۔ اور وہ چپ چاپ پارک کے جنگلے سے لگی متوحش سی دیکھ رہی تھی۔

''ارے ایسا ہی تو مرے جا رہا ہے تو میں کسی سے کم ہوں کیا...... جوان بھی تو ہوں۔ اس بڑھیا کو کیوں لوٹ رہا ہے مائی ملے۔''

شنو نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں سے اپنا گریبان اس زور سے کھینچا کہ اوپر کے دو بٹن ٹوٹ کر نیچے جا گرے اور ایک لڑھکتا ہوا اس کی ماں کی پاؤں کے پاس رک گیا۔ شنو نے چھاتی پر دو تھپڑ مارے۔

''اپنی ماں سے منہ کالا کیوں نہیں کر تا رے۔ حرام کے جنے۔ ارے یہ بدماسی تو ہمارے باپ کو کھا گئی۔ اب نیا یار ڈھونڈے ہے...... آخ تھو۔''

شنو کے منہ سے مارے غصّے کے جھاگ اُڑ رہا تھا۔ سانس پھول رہا تھا۔ ماتھے سے پسینہ بہہ رہا تھا...... اور قمیض بدن سے چپک گئی تھی۔

''کوئی تیری اپنی عجت (عزّت) تو ہے نہیں۔ سب جانے ہیں۔ اب ایک یہ بے سرم تجھے مل گئی۔'' وہ دوپٹے سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔ اور سر پکڑ کر کھنکارنے لگی۔ پڑوس کی

ابابیلیں لوٹ آئیں گی

ترنم ریاض

گاڑیوں کے ڈرائیور دُور دُور کھڑے ہو کر شنو کو خاصی دلچسپی سے دیکھ اور سن رہے تھے۔

"ارے او۔ مرد جات کے نام پر دھبے۔۔ادھر تو آ...... بلکونی سے دیکھ کر اندر چھپ گیا تو...... جرا نیچے اُتر...... تیری ماں کے یار کا گھر ہے کا...... چوکیدار ہی تو ہے تو...... میری ماں کی تنخواہ پر عیش کرے ہے حرامی پلے 'جین پہنے ہے...... ادھر تو آ...... اس بڈھی کو کیا مردانگی دِکھاتا ہے ہیجڑے...... آمجھ سے بات کر...... ارے ارے...... تھو ہے...... تھو ہے تجھ پر۔"

شنو نے داہنی طرف کی دیوار کے قریب تھوک دیا...... اور دونوں پیروں کے تلوے زمین سے لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس نے بازو اونچے اُٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ کر اُنگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں اور ہونٹ بھینچ کر تیز تیز سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اُس کے نتھنے کپکپا رہے تھے۔ دوپٹے سے اُس نے پسینہ پونچھا اور دوپٹے کو پیروں پر پٹخ دیا تھا۔

وہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ لوگ کچھ تو گھروں سے باہر تھے اور کچھ لمبی لمبی دوپہر کی نیند کا لطف لے رہے تھے۔ اور پھر کولروں اور ایئر کنڈیشنوں کے شور میں اُنہیں باہر کی آواز سُنائی بھی نہ دے رہی ہوگی۔ کہ میں بھی اتفاقاً ہی ڈاک دیکھنے کے لیے نیچے گیٹ پر آئی تھی۔

سامنے پارک کے جنگلے سے لگی ریشماں پتھر کی مورت سی کھڑی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے لے جا کر جنگلے کی سلاخیں پکڑی ہوئی تھیں۔ وہ کبھی اوپر بالکنی کی طرف نظر اُٹھاتی اور کبھی بپھری ہوئی بلی کی طرح چیختی شنو کو دیکھتی۔ اُسے شاید حالات کے یہ رنگ اختیار کرنے کی توقع نہیں تھی۔

ریشماں کی عمر کئی پنتالیس چھیالیس برس تھی۔ مگر دیکھنے میں وہ اپنی عمر سے دس برس کم نظر آتی تھی۔ سامنے کی مستطیل پارک کے گرد گلی نما پختہ سڑک کی، اور پارک کے اُس طرف کی قدرے چوڑی سڑک کی صفائی اُس کے ذمے تھی۔ وہ کئی برسوں سے محکمہ میونسپلٹی میں خاک روب تھی۔ بچے ہوئے وقت میں وہ گھروں میں صفائی وغیرہ بھی کیا کرتی تھی۔ محنت کش ہونے کی وجہ سے چاق و چوبند تھی۔

دو برس پہلے جب دولت زندہ تھا تو اُس کی کلائیوں میں درجن درجن بھر رنگین چوڑیاں سجا کرتیں۔ وہ اپنی چوڑیوں اور لباس پر دل کھول کر خرچ کیا کرتی تھی۔ ٹخنوں پر چھم چھم کرتیں پازیبیں پہنے وہ ادھر اُدھر ننگے پاؤں چلتے ہوئے کام کیا کرتی تو خاموش فضا میں حرکت

کا احساس ہوتا۔ شوخ رنگوں کے لباس پہنے ہوئے سجی سنوری سی۔

اُس کا رنگ کچھ سانولا تھا اور ہونٹ سیاہی مائل ارغوانی سے، جو چہرے میں سے نمایاں ہو کے، اُس کی چھوٹی مگر گہری سیاہ پتلیوں والی آنکھوں سے میل کھاتے تھے۔ گلے میں کالے کالے مہین دانوں کی مالا، کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں اور ناک میں ستارے کی ساخت کی لونگ۔

مگر دولت کے انتقال کر جانے کے ساتھ ہی وہ جیسے سجنا سنورنا بھول گئی۔ کچھ بیس بائیس دن تو اُسے اپنا ہوش ہی نہ رہا۔ گھر سے نکلی نہ کسی سے بولی۔ بیٹی نے سمجھایا بجھایا۔ کچھ بیٹی کے بچّوں نے اپنے بھول پن میں ماں کی ہاں میں ہاں ملائی اور اسے اپنا وجود باہر کی طرف کھینچا۔ جس دن وہ دوبارہ کالونی میں آئی تو کسی ہلکے رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی اُس کے گلے میں مالا بھی نہیں تھی۔ نہ ہی کلائیوں میں چوڑیاں۔ مگر اس سادگی نے اسے ایک الگ سا حسن عطا کر دیا تھا۔ جیسے ہری ہری گھاس پر کوئی سفید پھول کھل گیا ہو۔ یا نیلے آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا تیر رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کوئی غیر شادی شدہ لڑکی ہے جس کی شادی کی عمر بس نکلا چاہتی ہو۔ کچھ دن وہ تھوڑا تھوڑا کام کر کے کچھ وقت پارک کے کونے کے پاس باہری دیوار سے ٹیک لگا کر تھوڑا وقت بیٹھ کر چلی جاتی۔ مگر رفتہ رفتہ اُس نے پہلے کی طرح باقاعدگی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ کچھ اور گھروں میں بھی کام طے کر لیا۔ کیونکہ اب اُسے گھر جانے کی کوئی ایسی جلدی نہیں تھی۔

پارک کے کونے کے بالکل سامنے والا گھر توڑا گیا اور اُس کی جگہ ایک بڑی بلڈنگ تعمیر کی گئی۔ ریشماں نے بلڈنگ کے نئے مالک سے بات کر کے صفائی کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ جب تک عمارت کے سارے فلیٹ بک جاتے اسے ان کی صفائی کرنا تھی۔ اس کے بعد فلیٹ خریدنے والوں کی مرضی پر منحصر تھا کہ اسے رکھتے یا کسی اور کو۔

دن کا بیشتر حصہ وہ پارک کے گرد و پیش ہی نظر آتی۔ ایک گھر سے نکل رہی ہے۔ دوسرے گھر میں جا رہی ہے۔ کام میں مگن۔ چپ چاپ۔ شام ڈھلنے سے کچھ ہی دیر پہلے وہ گھر چلی جاتی۔ اب گھر میں اس کا کوئی منتظر نہ تھا۔ دولت تھا نہیں اور بیٹی سسرال لوٹ گئی تھی۔ اس طرح کوئی دو برس بیت گئے۔ ریشماں کی جفاکشی میں کوئی فرق نہ آیا۔ کونے والی بلڈنگ میں کوئی فلیٹ تو بکا نہیں ہاں ایک چوکیدار ضرور رکھ لیا تھا مالک مکان نے۔

چوکیدار گاؤں سے تازہ تازہ وارد ہوا تھا۔ چھبیس ستائیس سالہ نوجوان۔ گہری سانولی

رنگت کا۔ چمکیلے بالوں اور لمبے لمبے ہاتھوں پیروں والا۔

چندو کو کوئی کام تو تھا نہیں۔ سارا سارا دن بلڈنگ میں بیکار سا گھوما کرتا۔

اس دن ریشماں کچھ دیر سے کام پر آئی تھی۔ دراصل اسے سنار کے پاس جانا تھا۔ اپنی پازیب لینے، جو اس نے دھونے کے لیے دی تھیں۔ آج اس نے کلائیوں میں ایک ایک موٹی سی چوڑی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں ایک بالکل نیا ٹفن بکس بھی تھا۔ وہ تو اُدھر گھروں میں ہی کچھ کھا پی لیتی تھی۔ پھر یہ کھانا۔؟

"وہ چندو ہے نہ نا...... اس کے لیے...... بے چارہ کچھ کھاتا پکاتا تو ہے نی...... بس ادھر اُدھر ٹھیلوں پر کچھ چنے کلچے کھا کھا کر بیمار ہو گیا۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"کل میں صفائی کرنے گئی تو بستر پر پڑا تھا جنے کب سے۔ ۱۳ نمبر والے ڈاکٹر صاب سے دوائی مانگ لائی تھی میں پھر اس کے لیے۔ ورنہ جنے کب تک بیچارہ پڑا رہتا۔ کوئی ہے بھی نی اُس کا...... گاؤں میں دو بہنیں ہیں بس۔ کب کی بیاہی ہوئی۔" وہ بات کرتے کرتے کچھ لمحے رُکی پھر سر پر دوپٹے کا آنچل ٹھہراتے ہوئے نیچے دیکھ کر بولی:

"سادی! بھی ہوئی نا ہے اُس کی۔" اُس کے سانولے چہرے پر ایک لمحے کے کسی حصے میں قوسِ قزح کا رنگ سا لہرا گیا......

کبیر نے کہا تھا:

اکھت کہانی پریم کی کچھو کہی نہ جائے گونگے کیسری سر کرا بیٹھے مسکرائے

مگر دوسرے ہی لمحے مجھے خیال آیا کہ میرا یہ خیال صرف خام خیال ہے کہ اُس کی عمر چندو سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ اُس کی پہلی اولاد سے کچھ ہی بڑا ہو گا۔ تو...... تو یہ ممتا ہی کا رنگ ہو گا...... شاید بیٹے کی متمنی رہی ہو ریشماں۔

ریشماں نے چندو کا کمرہ سنوار دیا تھا اور ضرورت کی ہر چیز سے لیس بھی کر دیا تھا...... جیسے سٹوو، کڑھائی، پتیلی وغیرہ۔ پیسے اُس نے اپنی جیب سے خرچ کیے تھے۔ اُسے دولت کی پنشن بھی ملا کرتی تھی۔ اپنی تنخواہ تو تھی ہی...... تنخواہیں ان لوگوں کی نسبتاً بہتر ہوتی ہیں...... پھر اوپر کا کام بھی کرتی تھی...... اور اکیلی جان کا خرچ تھا ہی کتنا...... یہ سب اُس نے اپنی خوشی سے کیا تھا۔ کبھی کبھی وہ چندو کا کھانا بھی بنا دیتی بلکہ اُس نے اسے بھی کھانا بنانا سکھا دیا تھا......

چندو بھی ریشماں کے گھر جایا کرتا تھا۔

ریشماں اُس کا بہت خیال رکھتی تھی ...... ریشماں یا خود چندو کے گھر میں ہوتی تھی یا چندو اس کے یہاں ..... سارے سلسلے ویسے ہی چل رہے تھے اور شاید ایسے ہی چلتے رہتے کہ اچانک ایک دن شنو بھی بیوہ ہو گئی۔ ساس نے اُسے بچوں سمیت گھر سے نکال دیا تو وہ ماں کے گھر آ گئی اور حالات تیزی سے بدلنے لگے۔

شنو کو ماں کا چندو سے میل جول ایک آنکھ نہ بھایا اور اُس نے ماں سے بولنا کم کر دیا...... ریشماں چندو کے یہاں جاتی رہتی۔ اُسے وہاں صفائی بھی تو کرنا ہوتی تھی۔ بلکہ اب ریشماں کا زیادہ وقت چندو کے گھر ہی گزرتا چندو ریشماں کی مہربانیوں کا عادی ہو گیا تھا..... یا جو بھی تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔

شنو نے جب یہ محسوس کیا کہ ریشماں اپنی کمائی چندو پر خرچ کر دیتی ہے۔ تو ماں سے جھگڑنے لگی۔ ریشماں اُس کے ہر جھگڑے کا جواب خاموشی سے دیتی۔۔ اِس سے شنو کو اور شہ ملی..... بات ریشماں کی کھولی سے نکل کر آس پاس کی کھولیوں میں پھیلنے لگی......

اور شنو نے ماں کو کھلے عام بدنام کرنا شروع کر دیا۔

اُن دِنوں ریشماں کچھ پریشان پریشان سی رہنے لگی تھی حتیٰ کہ شنو یہاں چلی آئی اور پارک کے باہر چندو کو پکار پکار کر جانے کیا کیا اناپ شناپ بکنے لگی......

ریشماں جب بھی کچھ نہ بولی..... پارک کی ریلنگ تھامے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی..... چندو بھی گھر سے نہ نکلا۔

پڑوس کے بزرگ ملک صاحب نے شنو کو سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا...... ورنہ اس طرح کا برہنہ ہنگامہ کرنے پر اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگایا جا سکتا تھا۔ مگر اب زمانہ بدل گیا تھا اور اُس کا تعلق اہم فہرست سے تھا......

بہر حال جب وہ چلی گئی...... تو ریشماں وہیں ریلنگ کے پاس بیٹھ گئی...... کچھ اور لوگ بھی ادھر ادھر کھڑے تھے کچھ دیر بعد ملک صاحب نے ریشماں کو بلایا تو وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے پاس آ گئی۔

''سب جانتے ہیں کہ تیری بیٹی بکواس کرتی ہے۔تم کیوں اس طرح پریشان ہو رہی ہو۔

جاؤ۔ کام وام کروا پنا۔" ملک صاحب نے نرمی سے کہا۔ وہ سر جھکائے دوسری طرف چلی گئی۔

جب سے دس گیارہ روز گزر گئے۔ ریشماں کام پر نہیں آئی چندو بھی دو چار دن چھپا چھپا پھرتا رہا— کچھ اور دن گزرنے پر جب ریشماں آئی تو میں پہچان نہ سکی اسے۔ وہ دس برس جو اس کی عمر میں کم نظر آتے تھے اس نے ان پندرہ دنوں میں جی لیے تھے۔

اس کی آنکھوں کے گرد سرمئی دائرے پڑے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا۔ بیمار تھیں...... ؟" میں نے پاس جا کر دھیرے سے کہا۔

"نہیں جی۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"پھر اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہو؟۔ اتنے دن آئی نہیں۔"

"بس اب کام چھوڑ دوں گی جی۔" وہ یاسیت میں ڈوبے لہجے میں بولی۔

"کیوں۔ کام کیوں چھوڑو گی۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"گاؤں جاؤں گی۔ وہیں رہوں گی۔"

"مگر سب کچھ تو ٹھیک ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب جانتے ہیں۔"

"نہیں جی وہ بات نہیں...... وہ تو میں سہہ گئی تھی مگر...... " وہ گلوگیر سی آواز میں بولی۔

"پھر کیا ہوا تمہیں؟"

"اس کے دوسرے دن میں آئی بھی تھی......" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تو...... پھر کچھ ہوا؟"

"سب کام والیاں پارک کی دیوار کے پاس بیٹھی تھیں...... میں بھی تھی......

وہ جو اماں ہے نا...... وہ بوڑھی سی اماں...... جو بیس نمبر میں کھانا بناتی ہے بیس سال سے...... موٹے چشمے والی۔"

"ہاں ہاں...... تو"

"وہ بولی تو بیاہ کیوں نہیں کرتی اس چندو سے...... میں کچھ نہ بولی...... اتنے میں چندو بھی ادھر سے گذرا...... اماں نے اسے آواز دی۔ بولی بیاہ کا ہے نہیں کرتا اس سے۔ بدنام کر دیا بے چاری کو۔ میں چپ چاپ سنتی رہی۔ کچھ بھی نہ بولی۔ پھر۔ سب میرے کو بولنے لگیں کہ تو کیا کہتی ہے ریشماں...... چندو مجھے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ میں۔ میں۔ بولی کہ...... میں بولی

کہ ...... میں تو تیار ہوں ...... چاہے کہیں لے جائے مجھے ...... بس بی بی جی ...... اتنا بولی کہ وہ۔"
ریشماں پھوٹ کر رو پڑی......

"اتنا بولی کہ وہ......" وہ ہچکیاں لیتی رہی۔

"اتنا بولی کہ وہ۔غصے۔ہو گیا۔بولا میرا کچھ ہے نی اس کے ساتھ میں تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں...... اور بیر جور جور سے پٹختا ہوا چلے گیا......" ریشماں نے سر دیوار سے ٹکا دیا...... اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"اب جندہ نہ رہوں گی بی بی جی ...... کچھ کھالوں گی ...... جان دے دوں گی ...... میرے بنا چین نہیں تھا اس کو ...... اب مجھے جانتا ہی نہیں ...... دھوکے باج......"

ریشماں زار و قطار روئے جا رہی تھی......

□□

("ایوانِ اردو" نئی دہلی، ۲۰۰۰ء
"کتھا" انگریزی، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء)

برف گِرنے والی ہے

"سرکار نے بچّوں کے کام کرنے پرپابندی عائد کردی ہے۔" حاجرہ نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ چاولوں کی پیچھ لگا اخبار چپکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اس سے ہوا نہیں رکے گی۔ کوئی گتے کا ٹکڑا تلاش کرو۔" خضر محمد نے بیوی کی طرف دیکھا اور چولہے میں کل رات سے پڑی راکھ میں چلم سے بندھی ہوئی چمٹی کی مدد سے انگارہ تلاش کرنے لگا کہ تمباکو کے چوبی ڈبے میں سے اسے کچھ ادھ جلا تمباکو مل گیا تھا۔ اور صبح سے اس نے حقّے کا ایک کش بھی نہیں لگایا تھا۔

"تو پھر میں کیا کروں امی۔" جاوید دونوں ہاتھوں کو آپس میں تیزی سے رگڑتے ہوئے باری باری والدین کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اپنے بابا سے پوچھو۔ تنہا اس کی محنت سے ہم چاروں کا گزارہ نہیں ہو سکتا بیٹا دونوالے چاول بھی مشکل ہو جائیں گے۔"

"تم اب بچّے نہیں ہو بیٹا۔ بڑے ہو گئے ہو۔ میں بھی کمزور ہو گیا ہوں۔ مستقل زکام سے میرا سر درد کرتا رہتا ہے...... پھر تمہارے ہاتھ، انگلیاں بھی بڑی ہو گئی ہیں۔"

"مگر خواجہ صاحب تو کہہ رہے تھے کہ تمہاری انگلیوں میں اب بھی بڑی نزاکت و نفاست ہے۔ تم نمونوں کے بھی ماہر ہو گئے ہو۔ ابھی کچھ برس اور تم قالین بننے کا کام بہ آسانی کر سکتے ہو۔ وہ میری تنخواہ بھی بڑھا رہے ہیں، بابا۔"

"مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تمہیں کوئی مزدوری کا کام کرنا پڑے گا۔ یہ جو سماجی کارکنوں کا وفد تمہاری فیکٹری آیا تھا۔ وہ دوسری ملوں اور فیکٹریوں میں بھی گھوم رہا ہے۔ پھر خواجہ صاحب تو خود ڈر رہے ہوں گے تم لوگوں سے کام کروانے میں۔" خضر محمد چلم سے بندھی چمٹی

کی مدد سے چولہے میں پڑی راکھ کے نیچے دبا آخری انگارہ نکال کر چلم میں ڈالتے ہوئے بولا۔
"ہاں بیٹا۔ کچھ دن تو زور رہے گا۔ پھر شاید کچھ دیر خاموشی چھا جائے۔ یہ اجلے کپڑوں والے لوگ بڑی کھو کھلی ہمدردی جتاتے ہیں۔ کون ماں نہیں چاہے گی کہ اس کا بچہ پڑھے لکھے۔ مگر وہ کیا جانیں بھوک کیا ہوتی ہے۔"
اخبار کھڑکی پر نہیں چپک پایا تھا کہ کل رات پکے چاولوں کی پیچھ کا آخری قطرہ تک جاوید احمد نے صبح اپنی چھوٹی بہن کو چمچ سے پونچھ کر پلا دیا تھا۔ اور اخبار ٹھیک طرح سے نم نہیں ہوا تھا۔ حاجرہ نے کاغذ موڑ توڑ کر چولہے کی طرف اچھال دیا۔
"اب کیا ہوگا۔" اُس نے پاس رکھی کانگڑی میں پڑی راکھ میں انگلی ڈال کر اُسے پیندے تک ٹٹول ڈالا۔ کانگڑی میں ایک چنگاری تک نہیں تھی۔ ساری راکھ ٹھنڈی پڑی تھی گھر میں کئی دن سے کانگڑیوں کے کوئلے بھی ختم ہو چکے تھے اور لکڑی بھی تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ چولہے کی تھوڑی بہت آگ ہی کانگڑیوں میں استعمال ہوتی تھی۔
وہ دونوں ہاتھوں کو پھران کی آستینوں کے اندر سمیٹ کر مٹی سے پتی ٹھنڈی دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے پاس ایستادہ رہنے سے اسے سردی لگ گئی تھی اور آواز میں کپکپاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔
"اب سب ٹھیک ہو جائے گا امی۔" جاوید احمد یاسمین کو گود سے اُتار کر ماں کے قریب لے گیا۔ حاجرہ نے بچّی کو پھرن کے اندر باہوں میں سمیٹ لیا۔ پھرن کے گریبان سے بچّی نے اپنا چھوٹا سا سر باہر نکالا اور ماں کے رخسار کے ساتھ ٹکا کر بھائی کو دیکھتی ہوئی مسکرانے لگی۔
"کیسے ٹھیک ہوگا، بیٹا۔" حاجرہ نے جاوید احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ خود حاجرہ کی آنکھوں میں دونوں جہاں کی نا امیدی تھی مگر جاوید احمد کی نظروں میں قندیلیں سی روشن تھی...... اس کی ٹھوڑی پر چند ایک سیاہ بال نمودار ہو چکے تھے اور کچھ کنپٹی کے کانوں کے پاس بھی اگ آئے تھے۔ اس کی ناک اور رخسار سرخی مائل تھے اور گھنے گھنے بال ابھی بھی گیلے تھے گو کہ وہ کوئی دو گھنٹے پہلے سڑک کے اس پار طویل زینہ طے کر کے جہلم میں اتر کر نہا آیا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ سردی سے گھبراتا نہیں تھا۔ پھر گرم پانی اسے میسر بھی کہاں تھا۔ ایک بالٹی پانی گرم کرنے میں کتنا خرچہ ہو جاتا ہے۔ وہ سوچا کرتا۔
"بہت پہلے سے میرے پاس ایک کام کی دعوت ہے۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ مگر بابا

اب کروں گا۔ بس ذرا احتیاط کا کام ہے۔ اور پیسہ ہی پیسہ۔"

"جاوید احمد بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بولا۔

"سچ؟ پھر تم نے اب تک کیوں یہ کام شروع نہیں کیا۔ گھر میں راشن آجاتا۔ تم لوگوں کے گرم کپڑے بھی۔ برف گرنے والی ہے۔ یہ رضائی اب چھوٹی پڑتی ہے۔

ہم چاروں اس میں سماتے بھی کہاں ہیں۔ آڑھی اوڑھنے کی وجہ سے تمہارے بابا تو بمشکل چھاتی تک لے پاتے ہیں اسے۔ ایک بڑا سا لحاف بنوائیں گے۔ بہت سی روئی ڈلوا کر۔" حاجرہ کے چہرے سے کرنیں سی پھوٹنے لگیں۔

"تو پھر میں جاؤں۔ امی۔ بابا۔"

"لیکن کہاں جاؤ گے بیٹا۔" خضر محمد نے بجھی راکھ اور جل چکے تمبا کو والا خالی حقہ گڑگڑایا۔

"خلیل جو کے پاس" جاوید احمد نے مٹی کی دیوار میں پھنسائے گئے چھوٹے سے آئینے کے پُتے ہوئے حاشیے پر کہیں سے بھی نہ نظر آنے والی گرد پونچھنے کے بہانے آئینے میں ماں باپ کے چہروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ارے نہیں بیٹا یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ خدا نہ کرے کہ تم کوئی ایسا کام کرو۔" خضر محمد نے حقہ سامنے سے ہٹا دیا۔ اور تشویش ناک نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا۔

"خدا کے لیے بیٹا۔ تم ایسا سوچنا بھی مت۔" حاجرہ نے پھرن کے اندر سے یاسمین کو نکال کر کنول کی جڑوں کی گھاس سے بنی چٹائی پر لٹا دیا۔ اور اٹھ کر بیٹے کے قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"نہ میرے لعل۔ ہمارے پیٹ کے لیے اپنی زندگی مت بیچنا۔ بھوکی جی لوں گی۔ تمہیں کھو کر زندہ نہ رہ پاؤں گی۔ میرے بچے۔" اس نے اپنے سوکھے لب جاوید احمد کے بالوں سے لگالیے۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"ایسا نہیں ہوگا امی۔" جاوید احمد ماں سے لپٹ کر بولا۔ "اتنے لوگ تو کرتے ہیں کام۔ کتنے ہی ہیں جنہیں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ خواہ مخواہ دل ہار رہی ہیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھیے اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔"

"مگر اس میں دوسروں کی جانیں بھی تو جا سکتی ہیں اور وہ گناہِ عظیم ہے۔ اتنا بڑا خطرہ۔ اپنا، دوسروں کا۔ نہ بیٹا۔ نہ......" حاجرہ نفی میں گردن ہلاتی ہوئی بولی۔ "ایسا مت کرنا میرے بچے۔"

"خلیل جو کہتے تھے ثواب ہے۔ کچھ ہو گیا تو شہادت نصیب ہو گی۔ مگر میں اپنا خیال رکھنا جانتا ہوں بابا۔ امّی کو سمجھائیے نا۔" جاوید احمد کواڑ کے قریب بیٹھ کر اپنے جوتوں کا جائزہ لینے لگا۔ شکر ہے ابھی برف نہیں گری۔ بائیں جوتے کا تو تلا ہی الگ ہو رہا ہے۔ اسے سلوانا ہو گا۔ وہ موزے پہن کر باپ کو دیکھنے لگا۔ کچھ دن بعد وہ اپنے لیے نہایت عمدہ جوتے خرید سکے گا۔ جیسے خواجہ صاحب کا بیٹا پہنتا ہے۔ لمبے لمبے فیتوں والے ہلکے پھلکے سے۔

"تم۔ تم تو میرے رحمدل بیٹے ہو۔ یہ کام کیونکر کر سکتے ہو۔ زندگیاں تو سب کی قیمتی ہوتی ہیں۔" خضر محمد بیٹے کے پیروں کی طرف دیکھتا ہوا سمجھاتے ہوئے بولا۔ پھٹے موزوں میں سے جاوید احمد کی سرخ ایڑھیاں اور انگوٹھے بچوں کے پیروں کی سی نزاکت لیے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"ابھی کل ہی کی تو بات ہے سرخ بیر بہوٹی سا ننھا منا وجود دائی مہرو نے خضر محمد کی باہوں میں تھمایا تھا۔ اسے خضر محمد نے بیس روپے کا نوٹ انعام میں دیا تھا۔ مہنگائی بھی تو اتنی نہ تھی۔ حاجرہ نے پچیس روپے کی اون سے اپنے مُنّے کے موزے، سویٹر اور ٹوپی تک بُنی تھی۔"

دو جوڑے موزے بھی لاؤں گا اپنے لیے۔ خواجہ صاحب کے بیٹے کو کتنا لطف آتا ہو گا ایسے عمدہ جوتے پہن کر چلنے میں۔ جاوید احمد سوچ رہا تھا۔ ایک دن جب فیروز میاں ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں جاتے وقت جاوید احمد کی ہوائی چپلیں پہن گئے تھے تو ان کا جوتا پائیدان سے ہٹا کر ایک طرف رکھتے ہوئے جاوید احمد حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اتنا جسیم نظر آنے والا جوتا اور وزن نہ کے برابر۔ فیروز میاں چلتے کیا ہوں گے۔ اڑتے ہوں گے ہوا میں۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹے۔ بتاؤ نا۔ یہ کام تمہارے جیسے انسان کے لیے نہیں ہے۔ کچھ اور کام دیکھ لینا۔ دیکھتے ہیں خدا کی کیا مرضی ہے۔

کچھ دن ذرا صبر کرو۔ میں چشمہ بدل لوں گا تو باریک کڑھائی کا کام پھر سے شروع کروں گا۔ آمدنی بڑھ جائے گی۔ اس موٹی کڑھائی کے کام میں کمائی بہت کم ہوتی ہے۔ بس ذرا چار پیسے آجائیں تو ڈاکٹر......"

"چار پیسے۔ کہاں سے آئیں گے بابا۔ بھوکے پیٹ کتنے دن اور کس امید پر انتظار کریں گے۔ یاسمین بھوکی مر جائے گی۔ جانے خواجہ صاحب کب کام پر بلائیں۔ بلائیں گے بھی یا کیا معلوم۔ پھر گزارہ کہاں ہوتا ہے بابا۔" جاوید احمد جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔

"مگر یہ جان کا خطرہ۔ میرے بچے۔ جب جان ہی نہ رہے گی تو بھوک کیسے لگے گی۔ تمہارے بابا کچھ کریں گے۔ تم فکر مت کرو۔"

"جب تک جان ہے تب تک بھوک لگے گی ناں ماں۔ تمہیں لگی ہے نا؟ مجھے بھی لگی ہے۔ میں جلدی آؤں گا۔ تم فکر مت کرنا۔ جب میں آؤں گا تو گھر کا سارا سامان لے کر آؤں گا۔ اور مجھے آنے میں دیر ہوئی تو تم گھبرا مت جانا۔ اچھا بابا۔ خدا حافظ۔" جاوید احمد نے تیزی سے باہر نکل کر کواڑ بند کر دیے اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا بائیں جانب کی گلی میں مڑ گیا۔

"ارے بیٹا سنو تو۔" حاجرہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی مگر شدید دھند میں اسے جاوید احمد کا ہیولہ تک دکھائی نہ دیا۔ البتہ کہرے سے نم راستے پر اسے پھٹے تلے والے جوتوں کے گھسیٹے جانے کی سماعت سے دور ہوتی ہوئی غیر متوازن چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دھڑکتا ہوا دل دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ خضر محمد کی طرف پلٹنے لگی تو وہ بھی دہلیز تک آ چکا تھا۔

"جاوید۔"

ایک پکار فضا میں ابھری تو قریب کے کسی خزاں زدہ یخ بستہ درخت کی جمے ہوئے کہرے میں لپٹی ننگی ٹہنی پر بیٹھا کوئی کوا بولا اور اندر سے یاسمین کے رونے کی آواز آنے لگی۔

□□

("انشا" کلکتہ، ۲۰۰۰ء)

شیرنی

"میں ڈر گئی ...... بی بی ...... جی.... " نجمہ نے تھراتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ سانس پھولا ہوا تھا اور خوف زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں تلے ناک کچھ اس طرح سکڑی ہوئی تھی کہ ناک سے ملی ہوئی ایک لکیر سیدھی پیشانی کے درمیان تک جا رہی تھی۔

میں اُس کی بات سن کر ششدر رہ گئی۔ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہی۔ مگر نہیں۔ شاید وہ صحیح کہہ رہی تھی اور میرا دل ہی اُس کی بات پر یقین نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ،اب نجمہ چلی جائے گی کہ وہ اس سے پہلے کبھی کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتی تھی۔ کھیتوں اور جنگلوں میں ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے والی۔ ذرا سی آہٹ پر آدھی آدھی شب کواڑ کھول کر باہر چکر لگانے والی۔ مویشی کی پکار سن کر اندھیرے میں لال ٹین لیے درندے کی تلاش میں نکل پڑنے والی، ڈر کیسے سکتی ہے۔ کس سے ڈر سکتی ہے۔

میں کسی تقریب میں شرکت کے لیے اُس کے گاؤں گئی تھی۔ شہر سے آئے مہمانوں کی سکونت کا انتظام وہاں کے ڈاک بنگلے میں کیا گیا تھا۔ ڈاک بنگلہ جنگل کے دامن میں واقع تھا بلکہ جنگل کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ رندے سے ہموار کیے گئے اور وارنش سے چمکائے گئے تختوں اور شہتیروں سے بنا بڑے بڑے کمروں اور طویل غلام گردش والا دو منزلہ مکان جس کی ٹین کی چھت پر سبز رنگ کا روغن کیا گیا تھا۔ سامنے خوبصورت باغیچہ ،جس کی پتھر سے بنی چار دیواری پر سرخ اور زرد پھولوں کی بیلیں چھائی ہوئی تھیں۔ پچھواڑے سے مختصر سی راہداری سے لگا ہوا باورچی خانہ اور دوسری طرف چوکیدار کی کوٹھری۔ چوکیدار ہی مہمانوں کے لیے سارا انتظام کرتا تھا۔ اُس رات چوکیدار مہمانوں کو رات کا کھانا کھلانے کے بعد سامنے کی

چراگاہ سے لگی ڈھلوان اتر کر گاؤں کے اندر چلا گیا تھا۔ اسے کوئی ضروری کام تھا اور اس کی جگہ رات بھر ڈاک بنگلے میں رہنے کے لیے کوئی اور آنے والا تھا۔ رات رہنے کے لیے کوئی آیا کہ نہیں یہ معلوم کرنے کی کسی کو ضرورت نہ پڑی۔ سب اپنی اپنی خوابگاہوں میں چلے گئے۔

میرا کمرہ دوسری منزل میں تھا جس کی کھڑکیاں باغیچے میں کھلتی تھیں۔ رات کو اچانک میں جانے کس آہٹ سے بیدار ہو گئی۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ پردہ سرکایا تو سارا ماحول چھٹکی ہوئی چاندنی میں نہایا ہوا ملا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ عجیب روح پرور سی ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ ہوا میں جنگل کی خوشبو کے ساتھ باغ کی مہک بھی شامل ہو گئی تھی۔ مختلف نوع کے پھولوں کا منظر میں آنکھوں کے راستے دل میں اتارنے لگی۔ چاندنی میں باغیچہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مصوّر نے شوخ رنگوں سے بنائی کسی تصویر پر سرمئی گھول گرا دیا ہو۔ سارا ماحول سکون میں ڈوبا ہوا تھا۔

اچانک برآمدے سے ملحقہ چوبی زینے پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے کھڑکی سے گردن نکال کر نیچے کو جھانکا تو ایک چمکتی ہوئی پنڈلی نظر آئی اور پھر دوسری، اس کے ساتھ ہی پوری شبیہ میرے سامنے تھی۔ وہ کوئی طویل قامت لڑکی تھی جو ہاتھ میں لال ٹین لیے پھاٹک کی طرف جا رہی تھی۔ مہمانوں میں اُس حلیے کی کوئی لڑکی شامل نہ تھی۔ پھر......؟

مجھے سارا منظر کسی Horror فلم کا سین معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بغیر دائیں بائیں دیکھے سیدھا پھاٹک کے قریب چلی گئی اور بغیر کسی آہٹ کے زنجیر اتار دی۔ کواڑ کے قبضے دھیرے سے کچھ بولے اور پھر خاموش ہو گئے۔ لڑکی نے سلوار قمیض پہن رکھا تھا اور پائنچے گھٹنوں تک چڑھا لیے تھے گلے میں دوپٹہ تھا نہ پاؤں میں چپلیں۔ لمبی سی کمر پر موٹی سی چوٹی جھول رہی تھی۔

لڑکی کون تھی...... اور کہاں جا رہی تھی...... اس سناٹے میں...... آدھی رات کو......

مجھے بھوتوں چڑیلوں پر یقین نہیں تھا مگر......

جب اس نے ایک ہاتھ سے کواڑ بند کیے تو میں نے اُس کے دوسرے ہاتھ میں لمبے دستے والی کوئی چمکتی ہوئی چیز دیکھی تھی۔ دیوار کے اُس طرف ہوتے ہی وہ غائب ہو گئی۔ سامنے ہرے بھرے میدان میں کوئی شے متحرک نہ تھی۔ کھوکھلے تنے والا ایک بڑا سا اکیلا درخت خاموش کھڑا تھا۔ اچانک کسی جانور کی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی تو میں سمجھ گئی کہ ایسی ہی ایک آواز سے میری نیند ٹوٹی تھی۔ اُس کے بعد کسی بڑے سے پتھر کے گرنے کی

آواز آئی۔ اور ساتھ ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آہٹ بھی۔ اُس کے بعد کچھ دیر سناٹا رہا پھر لڑکی جیسے دیوار کی دوسری طرف سے پھوٹی اور درخت کے تنے کے قریب چلی گئی۔ لالٹین کی روشنی میں مجھے دور سے تنے کے پاس تقریباً کتے کی جسامت کا کوئی جانور لیٹا ہوا نظر آیا۔ لڑکی نے اسے بغور دیکھا اور واپس پھاٹک کی جانب چل پڑی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا یا شاید آرہا تھا۔ میں نے کمرے کی بتی روشن کی، کہتے ہیں بھوت پریت روشنی میں ......

لڑکی نے اندر داخل ہو کر زنجیر چڑھا دی اور میرے روشن کمرے کی طرف دیکھنے لگی

"سلام بی بی جی ...... کچھ چائے کافی لاؤں ...... نیند نہیں آئی۔"

وہ اوپر چہرہ کر کے بولی۔ وہ شاید مسکرا بھی رہی تھی۔ چاندنی میں اُس کا چمکتا ہوا چہرہ تو نظر آرہا تھا مگر نہ تو نقوش واضح تھے نہ تاثرات معلوم پڑ رہے تھے۔ میں اُسے کئی لمحے دیکھتی رہی۔

"تم کون ہو؟" میں نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد پوچھا اور مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میری آواز سُن کر اُس کا بازو بہت لمبا ہو جائے گا اور کھڑکی تک آکر مجھے دبوچ لے گا...... مگر ایسا نہیں ہوا۔

"میں نجمہ ہوں جی ...... میرا ابا یہاں چوکیدار ہے" وہ لال ٹین چہرے کے قریب لے جا کر بولی۔ وہ کوئی سولہ سترہ برس کی خوبصورت سی لڑکی تھی۔

"تم ادھر کہاں گئی تھیں ...... اس وقت ...... نجمہ۔"

"وہ جنگلی بلّا تھا جی ...... کئی دنوں سے مرغیوں کو کھائے جارہا تھا۔ مار دیا میں نے اُسے۔ آپ دیکھیں گی ......؟" وہ ایسی اونچی آواز میں باتیں کر رہی تھی جیسے اس وقت آدھی رات نہ ہو بلکہ دوپہر کا وقت ہو۔

"نہیں ...... شکریہ ...... اب میں سو رہی ہوں۔"

صبح میری آنکھ کھلی تو باغیچے سے باتی لوگوں کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بلّے کی لاش کا معائنہ کر رہے تھے۔ لمبے سے بلّے کی گردن پر کلہاڑی کا گہرا نشان تھا۔

بے چارہ بلاّ ...... مگر وہ لڑکی ...... مجھے خیال آیا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور وہ چائے کی کشتی لیے داخل ہوئی۔

"صبح بخیر بی بی جی ...... چائے پی کر نیچے آیئے گا میں آپ کو وہ جنگلی بلاّ دکھاؤں گی ...... شکر؟" وہ چائے بنانے لگی۔

"ایک چیچ...... تم کیسے جانتی تھیں کہ بلا ہی ہے۔ کوئی چیتا ویتا ہوتا تو؟" میں نے اُس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے لی اور اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی "ویسے تو مجھے پتہ تھا جی کہ بلا ہی ہے۔ مگر یہ بھی سوچتی تھی کہ کوئی لومڑی بھیڑیا، یا کوئی چیتا نہ ہو۔" وہ ہنس دی۔

"تو...... تم ڈریں نہیں۔"

"ارے نہیں جی میں تو اُس کا بھی یہی حال کرتی۔" وہ آنکھیں گول گول گھما کر ایک ترچھی نظر فرش پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"ڈر کاہے کا جی... ڈرنا تو صرف اوپر والے سے چاہیے۔"

نجمہ کی شادی دو تین برس میں ہونے والی تھی۔ مجھے اس کی سادگی اور بہادری کچھ ایسی بھائی کہ میں نے اُس کے والدین سے اسے ان دو تین سالوں کے لیے مانگ لیا۔ میں بھی شہر میں اکیلی رہتی تھی۔

ان لوگوں نے اُسے بخوشی میرے ساتھ کر دیا۔

میرا فلیٹ تین منزلہ مکان کی تیسری منزل پر واقع تھا۔ اور چھت پر ایک کونے میں ایک کمرہ بنا ہوا تھا اور اُس سے آٹھ دس گز کے فاصلے پر غسل خانہ وغیرہ باقی اطراف گملے ہی گملے تھے۔ کچھ پھولوں کے کچھ خالی، جن کے پودے خراب ہو چکے تھے۔

ہفتے بھر کے اندر اندر نجمہ نئے ماحول میں ایسے رچ بس گئی جیسے سال بھر سے یہیں رہ رہی ہو۔ علی الصباح نہادھو کر پودوں میں پانی دے کر بھیگی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک لیے نیچے آجاتی۔ میں آدھی سوئی آدھی جاگی دروازہ کھول دیتی۔ وہ ایک شاداب سی مسکان سجائے سلام کرتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی جاتی پھر کچھ دیر بعد چائے کی کشتی مسہری سے ملحقہ تپائی پر رکھ کر وہ مجھے میرا پرس پکڑا دیتی اور پیسے لے کر بازار چلی جاتی۔ پھر دن کا معمول شروع ہو جاتا۔ کبھی صفائی کبھی دھلائی کبھی باتیں کبھی آرام وغیرہ کسی دن اگر مجھے اسے اکیلا چھوڑ کر سارا دن بھی باہر رکنا پڑتا تو واپسی پر اُسے خوش و خرم پاتی۔ ضرورت پڑنے پر وہ شام کو بازار چلی جاتی تھی۔ وہ پہلی بار شہر آئی تھی، مگر اس بات کی اُسے کوئی خوشی تھی نہ غم، حیرت تھی نہ تجسس، اسے اپنے کام سے کام تھا۔ نہ تو وہ صبح کے وقت نیم سنسان سڑک پر چلنے سے گھبراتی تھی نہ ہی اترتی رات کے اندھیرے سے۔

پھر...... پھر اُسے ڈر کس شے سے لگا۔ اوپر تو ایسا کچھ نہ تھا جس سے وہ ڈر جاتی...... وہ

لیکن ڈر ہی کیسے سکتی تھی۔

"تم کس سے ڈر سکتی ہو؟" میں نے لفظ تم پر زور دیا۔

"مذاق تو نہیں کر رہیں..... " میں نے یقین اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے درمیان کہا اور باہری دروازہ بند کر کے اُس کے قریب آگئی۔

"اوپر..... کوئی..... کوئی ہے جی۔" وہ رُک رُک کر بولی۔

"کیا کوئی بھوت ووت ہے؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا اور مسکرانے لگی۔

"میں بھوت سے نہیں ڈرتی جی" اُس کی آواز کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی تو اُس نے چہرے پر آرہے بال انگلیوں سے کانوں کے پیچھے ٹانکے اور حلق کے پاس سے دوپٹہ ذرا سا کھینچ کر بالائی لب پر آرہا پسینہ پونچھا۔

"تو پھر کیا تھا جس سے تم جیسی بہادر لڑکی ڈر سکتی ہے۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تو وہ کچھ پل مجھے دیکھتی رہی اور پھر نظریں جھکا کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔ جانے کب اُس کی آنکھوں سے آنسوں نکل کر رخساروں پر ٹک گئے تھے۔

"کیا ہوا..... مجھے بتاؤ نا" میں نے پیار سے پوچھا تو وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ سمیٹ کر سسک پڑی۔

"دیکھو ایسے..... روؤ نہیں..... مجھے بتاؤ تو صحیح..... آخر ہوا..... کیا" میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں جب اپنے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے غسل خانے کی طرف جانے لگی ..... تو ایک عجیب سی..... آواز آئی....."

اُس نے دوپٹے سے آنکھیں اور ناک صاف کی اور آہستہ آہستہ بولی۔

"جیسے کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا ہو جی..... سنو کیا نام ہے تمہارا.....

میں گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کہیں کوئی نہ تھا۔ ساری چھت خالی تھی۔ میں سمجھی مجھے ایسے ہی وہم ہو گیا ہے۔"

"پھر.....؟ نہیں تھا نہ کوئی..... کیوں ڈر گئیں" میں نے اُس کی طرف دیکھ کر ابرو سکیڑ کر سر کے اشارے سے کیوں کہتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں جی..... تھا نا میں تو وہم سمجھی اور غسل خانے کی طرف جانے لگی ایک خیال یہ بھی

آیا کہ کہیں کوئی غسل خانے میں ہی نہ ہو...... روشنی بھی تو پوری طرح نہیں ہوئی تھی۔" وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"ارے...... رونے کے بغیر...... بس...... اب نہ رونا...... ٹھیک؟"

اُس نے آنسوں پونچھے۔

"ابھی میں نے غسل خانے کی طرف دو ہی قدم بڑھائے تھے کہ پھر سے آواز آئی۔

اے سنونا...... کیا نام ہے تمہارا...... میں بھی ادھر ہی رہتا ہوں...... اس ساتھ والے مکان میں کام کرتا ہوں...... ادھر دیکھونا...... مجھ سے کیا شرمانا دیکھو...... ادھر اوپر...... میں نے اوپر دیکھا...... پھر دائیں طرف کی دیوار کی طرف نظر ڈالی تو...... تو...... تو بی بی جی......" وہ پھر سسکنے لگی۔

" اُدھر...... دیوار پر ایک پاؤں ادھر کو لٹکائے ایک مونچھ والا لڑکا بیٹھا تھا جی...... میرے کمرے کے دروازہ کے بالکل قریب...... دیوار پر چڑھا ہوا...... میں ڈر گئی......"

❑❑

("شاعر" ممبئی، ۲۰۰۰ء)

میرا پیا گھر آیا

"کہاں سے آرہی ہو تم؟"

شمع کو باہر سے آتا دیکھ کر شہیر نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا تھا۔ اور شمع اسی کی طرف مسلسل دیکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"پانی بیگم صاحب!" اس نے ملازمہ کے ہاتھ سے پانی لے لیا۔ ایک گھونٹ بھرا اور شہیر کی طرف دیکھتی رہی۔ حسبِ معمول اسے شہیر کی بد زبانی بلکہ فحش کلامی کو سنتے اور ان سنا کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف لباس تبدیل کرنے جانا چاہیے تھا۔ مگر جب شہیر نے جملے کا آخری حصہ ادا کیا تو اس میں کچھ مختلف سے تاثرات کی آمیزش تھی کہاں سے آرہی ہو تم...... گرجتا ہوا حقارت بھرا لہجہ...... آرہی ہو تم تک آتے آتے ایک شکوے بھرے سوال پر ختم ہوا...... یا پھر...... شاید شمع کو ہی ایسا محسوس ہوا ہو...... کہ برسوں کے بعد بھلا اچانک ایسے...... کیسے۔

شمع نے گلاس لبوں سے لگا رکھا تھا۔ کانچ کے بڑے سے شفاف گلاس نے اس کی آدھی ٹھوڑی اور پوری ناک کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور گلاس کے اوپری کنارے کے بالکل قریب سے اس کی دو بڑی بڑی آنکھیں شہیر پر مرکوز تھیں۔ مگر وہ پانی نہیں پی رہی تھی۔

"انسان کو زندگی ایک بار ملتی ہے شمع۔ ایک ہی بار۔ ہو سکتا ہے میری زندگی ضائع ہو جائے۔ یا میں۔ اس زندگی کو ضائع کر دوں۔ تم خود ہی سوچو۔ مجھے کیا رشتوں کی کمی ہو گی۔ کسی چیز کی کمی ہے مجھے؟۔ بات باہمی سوجھ بوجھ کی ہوتی ہے۔ معیار کی ہوتی ہے۔ تم میرے معیار پر بالکل پوری اترتی ہو تمہاری سوچ میری سوچ کے عین مطابق ہے۔"

وہ سر جھکائے سنا کرتی۔ معیار۔ کس کا معیار زیادہ اہم ہے۔ اسے خیال آتا مگر وہ اس پر

بالکل نہ سوچتی۔ وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوتا تو شمع رک رک کر بولتی۔
"صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ۔ مگر ہمارے دونوں بھائی نہیں مانیں گے۔ وہ لوگ آپ کو غلط سمجھتے ہیں۔ پہلی شادی کی ناکامی کے لیے سب آپ ہی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ میں نے بھی اب جانا ہے آپ کو۔ ورنہ یہاں جوائن (join) کرنے سے پیشتر ہمارے جاننے والوں نے عجب انداز میں خبردار کرایا تھا ہمیں۔"
"کیا کہا تھا آپ کے جاننے والوں نے؟" شہیر نے برجستہ سوال کیا تھا۔
"یہی۔ کہ آپ۔ اچھے انسان نہیں ہیں۔ آپ کے نزدیک عورت صرف جسمانی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اور۔ اور۔"
"اور؟"
"اور یہ کہ آپ گھر بسانا چاہتے ہی نہیں تھے کبھی۔" شمع نے جلدی سے کہا۔
"اگر وہ سب سچ ہوتا تو میں تم سے یہ باتیں کیوں کہتا۔" شہیر نے چہرے پر اداس سے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔
"پھر ہمارے آپ کے خاندان بھی الگ ہیں۔ رشتوں کے معاملات میں اب بھی ہمارے یہاں کچھ ایسے سمجھوتے نہیں ہوا کرتے۔ رشتے انہیں میں ہوتے ہیں جو ہمارے برابر کے ہوں، زمین دار، جاگیر دار، چک دار وغیرہ رہے ہوں۔" شمع نے ٹھہر ٹھہر کر بات پوری کی۔
"ارے۔ چھوڑیئے نا۔" شہیر نے اپنا بایاں ہاتھ جھٹک کر کہا۔
"وہ وقت چلا گیا۔ پھر آپ کے خاندان والوں نے اگر عقلمندی سے کام لیتے ہوئے زمین کا بیشتر حصہ خود کاشت نہ دکھایا ہوتا تو آپ کے ہاتھ سے بھی خاصی زمینیں نکل جاتیں۔ خیر اب کہاں وہ زمانہ اب تو بس، ایک ہی صف میں کھڑے ـــــ ہمارے پاس تو کوئی زمین جائداد نہ تھی۔ ہم نے پڑھا۔ اچھی نوکریاں کیں۔ اب آپ کے سامنے ہیں۔" شہیر آخری جملہ ادا کر کے فخریہ انداز میں گردن تان کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔
"آپ کا مطلب ہے ہم لوگوں کے ہاں تعلیم نہیں ہے؟" شمع نے چہرے پر مسکراہٹ سی بکھیرتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں نہیں کیوں نہیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ اب سرا زادینے والا زمانہ نہیں ہے۔ آپ بس ذرا سا اڑ جایئے کہ آپ ہم ہی سے شادی کریں گی اور پھر دیکھئے۔"

''یہ مشکل ہوگا۔ اپنی زبان سے اپنی شادی کے بارے میں کیسے میں ایسی بات کہہ دوں۔''

''اچھا آپ بس اتنا کیجیے گا کہ کسی اور رشتے کے لیے ہاں نہ کیجیے گا۔ ہم ایک ایسے آدمی کو بھیجواتے ہیں کہ بس آپ دیکھتی جائیں۔''

کسی طرح رشتہ طے ہو گیا۔

''منگنی، مبارک۔'' شہیر مسکرا کر بولا۔

''آپ کو بھی۔'' وہ شرما گئی۔

''ہم دونوں کو۔'' وہ دونوں ہنس دیے اور میز کے اطراف بیٹھے آہستہ آہستہ کافی کے گھونٹ بھرتے رہے۔

''اب آپ خدارا لمبا چوڑا جہیز مت لے آیئے گا۔''

''جو گھر میں سب کو دیا گیا۔ ویسے ہی۔''

''نہیں۔ ہرگز نہیں۔'' شہیر نے ہتھیلی سے ٹھہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''ہم اسے اپنی بے عزتی خیال کریں گے۔ ہمیں قطعی کچھ نہیں چاہیے۔ یہ آپ بھی گرہ میں باندھ لیجیے اور اپنے گھر والوں کو بھی بتا دیجیے گا۔''

شمع دلہن بنی زیورات سے لدی، ڈھیروں ارمان بغیر سامان لیے سسرال آ گئی۔

اس دن سسرال میں اس کا تیسرا دن تھا۔ شب کے پہلے پہر کا کوئی وقت تھا۔

وہ...... اپنے آپ کو بھاری زیورات سے آزاد کر رہی تھی۔

''آپ کی خالہ زاد بہن کہہ رہی تھیں کہ۔ کہ خالی خولی چلی آئیں۔''

شمع نے اندر داخل ہوتے ہوئے شوہر کے عکس کو آئینے میں دیکھ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔''انہیں مجھ سے کیا مطلب۔'' وہ جیسے کہ اپنے آپ سے بولی تھی۔

''ٹھیک ہی تو کہا۔ ہمارے گھر میں کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے سنا کہہ دیا۔'' وہ مسہری پر دراز ہو گیا۔

''کیا مطلب۔'' شمع یکلخت شوہر کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی ''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''یعنی...... یعنی، آپ نے خود ہی تو۔'' شمع کی آواز کپکپانے لگی۔ اس کے دماغ پر

ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ اسے اپنی سماعت پر اعتبار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''یہ۔ نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ بھی۔ یہ کیسے انسان ہیں۔''

اس کے لیے سوچنا تک کٹھن ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ وہ اٹھ کر مسہری تک گئی اور یقین اور بے یقینی کے عالم میں شہیر کو دیکھنے لگی۔ شہیر نے بازو اس طرح ماتھے پر رکھا ہوا تھا کہ اس کی کہنی سے کلائی تک کا حصہ اس کے آدھے ماتھے، ابروؤں اور آدھی آنکھوں کو چھپا رہا تھا۔ بازو کے نیچے سے اس کی آنکھیں بند معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ بات شمع کو بہت دن بعد معلوم ہوئی کہ شہیر کچھ اس طرح آنکھیں میچ لیتا ہے کہ پلکوں کے عقب سے صاف دیکھا کرتا ہے۔

شمع نے شہیر کو ایسے سوتے بنے دیکھا تو بتی گل کر کے لیٹ گئی۔

جانے کتنے گھنٹے وہ نہ جانے کیا سوچ کر روتی رہی۔ شہیر کروٹ بدل کر سو چکا تھا۔

سحر کے وقت کہیں شمع کی آنکھ لگ گئی۔

صبح جب شمع بیدار ہوئی تو شہیر دفتر کے لیے نکل چکا تھا۔ دن جیسے تیسے کٹ گیا تھا اور اب شام ڈھلے بھی کئی گھنٹے ہو گئے تھے۔ شہیر واپس نہیں آیا۔ کوئی فون بھی نہیں کیا اس نے۔ وہ بے چین ہو کر سوچنے لگی۔ پھر برآمدے میں آ گئی اور نظریں گیٹ پر لگا دیں۔ کبھی چلنے لگتی، کبھی ٹھہر جاتی۔ اس کی خیرت کی دعائیں مانگتی ہوئی وہ برآمدے اور زینے کے درمیانی ستون سے لگ گئی۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ ہوا میں فرحت بخش سی خنکی تھی۔ اس نے اپنا گرم گرم رخسار ٹھنڈے ٹھنڈے سے سیمنٹ کے ستون سے لگا دیا۔ اس کے سینے سے ایک سلگتی ہوئی آہ نکلی اور کافی دیر سے ٹھہرا ہوا ایک آنسو آنکھ کے اندرونی کونے سے نکل کر لڑھکتا ہوا۔ ناک کو بھگوتا ہوا اس کے بالائی لب پر آ ٹکا۔ عقب سے دروازہ وا ہونے کی آواز آئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''تم کھانا کھا لیتیں۔'' اس کی ساس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا تو اس کی دونوں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

''ارے۔ نادان ہو تم۔ ابھی آ جائے گا گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں اور بالکل ٹھیک ہو گا۔ آ جاؤ تم کھانا کھا لو۔'' اس کی ساس اندر کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔ اب سے ڈیڑھ گھنٹے بعد۔ یعنی ساڑھے گیارہ بجے۔ اور۔ امی کو معلوم بھی ہے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ کہاں گئے ہیں۔ وہ اور جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

اس کے پاؤں وہیں منجمد ہو گئے۔

ڈیڑھ گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزرا کہ شہیر کی گاڑی کے ہارن کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بھاگ کر گیٹ کھولنے گئی۔ گاڑی پہلے دائیں اور پھر بائیں طرف سے پھاٹک کی دیواروں کے ساتھ رگڑ کھاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ شمع حیرت زدہ دیکھتی رہ گئی۔ یہ آج گاڑی کیسے چلا رہے ہیں۔

وہ سوچنے لگی۔ مگر جب شہیر گاڑی سے اترا تو خود بھی دائیں بائیں ڈولتا ہوا غیر متوازن طریقے سے چل رہا تھا۔

''کیا ہوا...... ؟'' وہ تشویش ناک آواز میں بولی۔ اور دھڑکتے دل میں ہر طرف سے آتے ہوئے غیر مبہم خیالات میں گھری اس کی طرف لپکی تو بدبو کا ایک بھبھکا اس کی شامہ سے ٹکرایا۔ دل کی دھڑکن پل بھر کو ساکت سی ہو گئی اور وہ خود بھی کچھ دیر کے لیے بے جان مجسمہ کی طرح بے حس و حرکت، لڑکھڑا کر چلتے ہوئے شوہر کو اندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے دماغ میں ریت سی اڑنے لگی۔ بے شمار رنگوں کے بے شمار ذرات۔ کوئی سرخ کوئی ہرا کوئی نیلا کوئی نارنجی کوئی اودا کوئی سیاہ اور نہ جانے کون کون سا۔ اور آخر اس طوفانی ریت نے اس کے تصور کی بینائی کو اتنا دھندلا دیا کہ وہ کچھ دیکھ نہ سکی۔ پھر کچھ دیکھ نہ سکنے کے بعد وہ کسی روبوٹ کی طرح آگے بڑھی اور لڑکھڑاتے ہوئے شوہر کا بازو تھام لیا۔

زندگی رینگنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وقت اژدہا بن کر اُس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا ہے۔

پھر ایک دن ٹیلیفون پر کسی نے اس سے کہا تھا کہ آپ کی گرہستی خطرے میں ہے۔ آپ خود معلوم کر لیجئے۔ میں ایک خیر خواہ ہوں...... فون بند ہو گیا۔

شمع نے ذرا سی کوشش کی تو بات واضح ہو گئی کہ شہیر آجکل اکثر ہی کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ اُسے خود کسی ایک آدھ تقریب کے علاوہ شہیر کے ساتھ کہیں جانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس کی رات نشے کی نذر ہو جاتی۔ صبح وہ جلدی آفس چلا جاتا، یا جانے کہاں۔ شہیر اپنا سارا وقت اپنی مرضی سے گزارتا۔ اس میں وہ وقت بھی شامل ہوتا جو شمع کے ساتھ گزرتا۔

شمع کا رشتہ آنسوؤں سے جڑ گیا اور خدا کے حضور شکایتوں کا دفتر کھل گیا۔ حالات کا یہ

کڑوا زہر وہ اکیلے کیسے پی جاتی اسے کسی کا سہارا تو چاہیئے تھا۔ وہ دن بھر شام کے انتظار میں بجھی بجھی رہتی۔ شام میں سلگنے لگتی اور شب بھر قطرہ قطرہ آنسو بن کر بہتی رہتی۔ اسے اس گھر سے اُس کے مکینوں سے زندگی سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اس پر اس کی ننھی سی بچی کی زندگی کا انحصار نہ ہوتا تو شاید کچھ کر بیٹھتی۔

وقت ہوا کی زد میں آئی کتاب کے پنوں کی طرح پلٹتا گیا۔

شمع کی نند بیاہی گئی۔ دیور دُور دیس چلا گیا۔ ساس اللہ کو پیاری ہو گئی، پھر سسر بھی۔ شمع کی زندگی اولاد کی محبت کے سہارے کٹ رہی تھی مگر اسے سکون میسر نہیں تھا۔

مگر ادھر اس کی زندگی میں ایک عجیب موڑ آ گیا۔ اس کی محبت میں ایک اور محبت کا اضافہ ہو گیا۔ یہ بات اس کے قلب رنجیدہ کے زخموں پر مرہم ثابت ہوئی۔ ایسا مرہم کہ نہ کہیں درد رہا نہ اس کا احساس۔ رفتہ رفتہ اس کے اشک ٹھہر گئے۔ سکون لوٹ آیا۔ وہ اس محبت سے اس قدر خوش اور مطمئن تھی کہ اس نے شبیر کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

وہ بیوی ہونے کے سارے تقاضے پورے کرتی، گرہستی کا ہر کام خوش اسلوبی سے نبھاتی۔ مگر جب بھی اسے کچھ وقت ملتا وہ اپنے محبوب سے ملنے چلی جاتی۔ اب ایک عرصے سے اس نے شبیر سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

گو کہ شبیر اس کے کبھی کبھار پوچھے گئے سوالات کا جواب طعن وطنز سے دیتا تھا۔ اس نے کبھی اسے مطمئن جواب دینے کی کوشش تک نہیں کی تھی یا شاید اس کے پاس اس کے لیے جواب ہی نہ تھا، مگر پھر بھی شمع کے سوالات اس کے ذہن میں گونجا کرتے تھے۔ کسی کسی وقت وہ ان پر سوچتا بھی تھا۔

ادھر شبیر اس کے بدلے ہوئے رویے سے بہت خوش تھا۔ اب نہ کوئی تقاضا تھا نہ کوئی سوال۔ وقت اس کے لیے اور زیادہ سہل ہو گیا۔ مگر مسلسل عیاشیوں سے اس کی صحت خراب ہونے لگی تھی۔ چہرے کی رونق ختم ہوا چاہتی تھی۔ اور وہ اپنی عادتیں بدلنے سے معذور تھا۔

پہلے تو شمع برسوں مستقل طور پر رنج وغم سے دوچار رہنے کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی۔ نہ تو شبیر کے پاس اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے وقت بچتا تھا نہ ہی وہ سجتی سنورتی تھی۔ اپنے وجود تک سے بے پرواہ ہو گئی تھی۔ مگر اب اس نئی چاہت سے اس کے چہرے کا مرجھایا پھول نہ صرف کھل اٹھا تھا بلکہ اس پر عجیب طرح کی چمک بھی آ گئی تھی۔ یہ تبدیلی

نادانستہ طور پر رفتہ رفتہ ہوئی تھی۔ شمع کو خود بھی اس بات کا کوئی احساس نہ تھا۔ایک دن شہیر نے ہی یہ بات اچانک دریافت کی تھی۔

صبح کے تین بجے تھے۔ نشہ ٹوٹنے کے ساتھ اس کی نیند بھی ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ کے بھنور بنا بنا کر اڑانے کے بعد پھر بستر پر دراز ہو گیا اور بے مطلب کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی اس حرکت کی وجہ سے ہمیشہ شمع کی نیند کھل جاتی تھی اور پہلے کئی برس وہ اُس بات پر کڑھتی اور پریشان ہوتی تھی۔ اور شہیر بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بدکلامی شروع کر دیتا تھا۔ مارے کوفت کے اگر شمع کے ہونٹوں سے آہ بھی نکل جاتی تو وہ اس موقعے کو جانے نہ دیتا۔ دوبارہ سونے سے پہلے زہر آلودہ لہجے میں دو چار کڑوے کسیلے جملے کہنا نہ بھولتا۔

"نیند میں مخل ہو رہے ہیں ہم شہزادی عالم؟۔ زمین داریاں تو ختم ہو گئیں۔ مگر یہ آرام طلبیاں نہ گئیں۔" وہ جملہ مکمل کر کے ایک کھوکھلا قہقہہ لگاتا۔

"مائیکے سے دو چار باندیاں لے آتیں تو اس وقت محترمہ کو ہاتھوں میں اٹھا کر دوسرے کمرے میں مسہری پر لٹا آتیں۔" وہ سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر کھانسنے لگتا۔ شمع نے کبھی اس طرح کی کوئی بات ہی کی تھی نہ ایسا جتانے کی کوشش کی تھی۔

خدا جانے کیا بات ہے شہیر کے اندر جو اس سے اس طرح کے طنزیہ جملے کہلواتی ہے شمع سوچا کرتی۔

ادھر کچھ دو تین برس سے جوں ہی شہیر کے کروٹیں بدلنے اور سگریٹ کی کثافت سے شمع کی آنکھ کھلتی، وہ فوراً بستر چھوڑ کر بٹیا کے کمرے میں چلی جاتی۔ شہیر نے کبھی خیال نہ کیا کہ شمع وہاں جا کر سوتی بھی تھی یا نہیں۔ وہ یہ بات بھی کہاں جانتا تھا کہ شمع کا اپنے محبوب سے ملاقات کرنے کا یہ بھی ایک وقت تھا۔

اس دن کوئی تعطیل تھی۔ جمعہ کا دن تھا اور اگلے دو دن بھی چھٹی کے تھے شہیر کا دوستوں کے ساتھ کہیں باہر جانے کا پروگرام تھا۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب شہیر بیدار ہوا تو اس نے شمع کو کہیں جانے کے لیے تیار پایا۔ شمع نے سیاہ رنگ کا قمیص سلوار پہنا ہوا تھا۔ پیروں میں چھوٹی چھوٹی ایڑھیوں والے سیاہ سینڈل جو سامنے سے جوتے کی طرح بند تو تھے مگر انگلیوں کی جگہ سے کھلے تھے۔ کھلے پائچوں کی سلوار کے نیچے اس کے پاؤں کانچ کے شفاف ٹکڑوں سے نظر آ رہے تھے۔ قمیض کی آستینیں کلائیوں کو ڈھک رہی تھیں۔

ہاتھوں اور پیروں کے صفائی سے تراشے گئے ناخنوں کے قریب سے انگلیوں کے گلابی پور گلاب کی کلیوں کی طرح لگ رہے تھے۔ اس کے شانوں پر دبیز جارجیٹ کا چوڑا سا چادر نما سفید دوپٹہ لہرا رہا تھا آنکھوں میں سرمے کی پتلی سی لکیر تھی بالوں کو اُس نے کسی ہوئی چوٹی کی شکل میں گوندھ رکھا تھا جو کمر سے نیچے تک جا رہی تھی۔

پتہ نہیں شمع کے بال اتنے لمبے کب ہوگئے تھے۔ اور سیاہ دائروں میں پھنسی دھنسی آنکھیں بہت پہلے کی طرح گہری گہری سی کب لگنے لگی تھی۔ پہلے وہ ناخن تھوڑے تھوڑے بڑھا کر ان پر پالش لگایا کرتی تھی۔ پتہ نہیں اس نے انہیں تراشنا کب شروع کر دیا تھا۔ اس کی جلد کا رنگ بھی شادی سے پہلے کی طرح سنہری مائل گلابی ہو گیا تھا۔

شبیر دو سرہانوں کو اوپر نیچے رکھ کر ان پر کہنی ٹکا کر مسہری پر نیم دراز سگریٹ کے دھوئیں سے دائرے بناتا ہوا شمع کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے سامنے سادہ سے ملکوتی حسن کا ایک شاہکار تھا، جس کے پاس سے نور کی سی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

''بچّی سو رہی ہے آپ کے پیچھے۔ اس طرح کمرے کو دھوئیں سے آلودہ تو نہ کریں۔'' شمع نے شبیر کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

''تم کہاں جا رہی ہو بچّی کو چھوڑ کر۔ ایسی ہی فکر ہے تو ساتھ لے جاؤ۔''

''میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ جاگ رہی ہوتی تو ساتھ لے جاتی۔ پھر آپ تو آج یہی ہیں۔''

''کہاں جا رہی ہو۔ تم؟'' اس کی آواز اونچی تھی۔

''کام ہے کچھ۔ ایک دو گھنٹے میں لوٹ آؤں گی۔''

''دو گھنٹے میں۔ کیا ہمیشہ ایسے ہی جاتی ہو۔ کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ۔'' شبیر غصے سے پھنکنے لگا۔

''تو تم اپنی بھولی بسری زمیندارانہ عیاشیوں پر اتر آئیں۔'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ اسے یقین تھا کہ شمع کہے گی کہ اسے آج ہی فلاں کام پڑ گیا ورنہ وہ کہاں جاتی ہے۔ مگر شمع اس کے اس انداز سے حیرت زدہ تھی۔ شبیر میں تمام برائیاں سہی مگر اس نے آج تک شمع کے کردار پر کبھی انگشت نمائی نہیں کی تھی۔ شمع کا دل بیٹھ سا گیا۔

انہیں مجھ پر شک ہو گیا ہے۔ آج تک تو کبھی مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ انہوں نے۔ آج انہیں مجھ سے بات کرنے کا وقت مل گیا۔ یعنی مجھ سے سوال کرنے کے لیے وقت

ہے ان کے پاس۔ وہ سوچنے لگی۔ اس کے دل ودماغ میں غصے کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔
''ہاں اکثر جاتی ہوں'' وہ دوپٹہ سنوارتے ہوئے بظاہر سکون سے بولی ''اور آپ آہستہ بولیے۔ اس کی نیند خراب کر رہے ہیں آپ۔''
''نہیں مجھے بتاؤ تم کہاں جاتی ہو۔ جاتی کہاں ہو تم۔'' وہ بستر پر اٹھ بیٹھا اور گرج کر بولا۔
مُنّی نے مُنّی مُنّی آنکھیں کھولیں۔ اور ننھی سی ناک اوپر کو سکیڑ کر دائیں بائیں دیکھا۔ پھر دونوں ہونٹوں کو جوڑ کر نچلا ہونٹ آگے کو نکال کر چند سکنڈ کے لیے منہ بسورا اور پھر چھوٹا سا دہانہ پورا کھول کر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ شمع نے ایک عجیب سی نظر جس میں غصہ تھا نہ شکوہ یا شاید کوئی اور تاثر۔ شہیر کے چہرے کی طرف ڈالی پھر اس کے آلتی پالتی میں مڑے ہوئے گھٹنوں کی طرف دیکھا اور مُنّی کو بانہوں میں لے لیا۔
''کھانا ہاٹ کیس میں ہے اور چائے تھرماس کیتلی میں۔ ڈائننگ ٹیبل پر رکھا ہے سب کچھ۔ میں جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔''
وہ باہر کی طرف لپکی۔
''مُنّی کو کہاں لے جا رہی ہو؟'' شہیر اُچھل کر اس کے سامنے آ گیا۔
''ساتھ۔ میرے لوٹنے تک سوتی رہتی۔ جگا دیا۔ غریب کو۔''
''تمہیں جہاں جانا ہے جاؤ۔ مُنّی نہیں جائے گی۔'' وہ منی کو ایسے گود میں لینے لگا جیسے شمع سے اسے چھین رہا ہو۔
''ٹھیک ہے۔'' شمع نے جلدی سے گرفت ڈھیلی کر دی۔ ''خدا حافظ'' وہ کمرے سے نکلتی ہوئی بولی اور شہیر ایک دم مسہری کی طرف مجھے تمہاری پرواہ نہیں، والے انداز میں پلٹا۔ شمع مسکراتی ہوئی باہر آ گئی۔
شاید اس لیے کے اس طرح کا تصادم پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ ورنہ شمع کس گنتی میں تھی کہ اس سے کچھ پوچھا جاتا۔ اسے تو بتایا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا۔ حکم دیا جاتا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی مسکراہٹ ایک مہین سی ہنسی میں بدل گئی۔
شمع کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں گئی۔ اور سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر شہیر مُنّی کو گود میں لیے کھڑکی تک آیا۔ یہ بیگ ان دونوں نے ہنی مون سے لوٹتے ہوئے خریدا تھا۔

شمع بیگ میں کیا لے کے جا رہی ہے۔ کہاں جا رہی ہے۔ شبیر دن بھر سوچتا رہا۔ شمع دو کی بجائے پانچ گھنٹے بعد لوٹی۔

جب وہ باہر کے دروازے میں چابی گھما کر اندر داخل ہوئی تو شبیر فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے شب خوابی کا لباس بھی نہیں بدلا تھا۔

"نہیں یار۔ آج بالکل نہیں آسکوں گا۔ پھر کبھی سہی۔"

وہ اکتائے ہوئے انداز میں عجلت، سے کہہ رہا تھا۔

"اچھا میں تھوڑی دیر میں بتاتا ہوں، بائے۔" شمع پر نظر پڑتے ہی اس نے فون بند کر دیا شاید مخاطب کا اسرار شدید تھا۔

"اتنی دیر کہاں لگائی تم نے۔" اس نے قہر بھری نظروں سے شمع کی طرف دیکھا۔

"کام کچھ زیادہ نکل آیا تھا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"اس بیگ میں کیا لے گئی تھیں۔" وہ بیگ کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"کچھ سامان تھا۔ اسے کھنگال کر الگنی پر ڈال دو۔ ذرا صابن بھی لگا دینا۔" شمع نے بیگ ملازمہ کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ اتنا خوبصورت بیگ۔ کس لاپرواہی سے میلا کر دیا تم نے۔"

شبیر شمع کا یہ بدلا ہوا رنگ دیکھ کر اپنی حیرت اور غصے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کسی جواب کی توقع میں شمع کی طرف دیکھ کر بولا مگر شمع نے کوئی جواب نہ دیا اور کپڑے بدلنے کے لیے اندر کی طرف چلی گئی۔

کچھ دیر بعد شبیر کے دوست کا فون آیا۔ کچھ دیر بحث ہوتی رہی پھر فون بند کر دیا گیا۔

"میں اتوار کی شام تک باہر رہوں گا۔ تم ان دنوں گھر سے باہر مت جانا۔ مجھے ملازم لوگوں پر بھروسہ نہیں ہے۔ شبیر کچھ تحکمانہ سی آواز میں شمع سے مخاطب ہوا۔ مگر اس کا چہرہ اس کی تشویش کی صفا چغلی کھا رہا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر شمع دل میں دبی ہوئی جانے کون سی خوشی کو بمشکل تمام قابو میں رکھ سکی۔ مگر شبیر اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے بغاوت کرتی ہوئی مسکراہٹ کو بھانپ گیا اور یکلخت پلٹ کر باہر نکل گیا شمع کواڑ کی طرف دیکھتی رہی، جس کے اوپر ایک خوبصورت فریم کے اندر عربی میں ایک عبارت تحریر تھی۔

ان اللّٰہ مع الصّابرین۔
خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
وہ مسکراتی ہوئی مُنّی کے قریب گئی اور اسے باہوں میں لے کر اس کے نرم بالوں پر اپنا رخسار لگا کر جانے کہاں دیکھنے لگی۔

دوسرے روز ہفتہ تھا۔ شہیر کو اتوار کو آنا تھا۔ مگر شہیر اچانک ہفتے کی دوپہر آگیا۔ اس نے دروازے کی گھنٹی پر کچھ اس طرح انگلی رکھ دی کہ گھنٹی مسلسل بجتی چلی گئی۔ شمع ہڑبڑا کر دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازہ وا ہوتے ہی شہیر، شمع کو تقریباً دھکا دے کر سامنے سے ہٹاتے ہوئے تیزی سے اندر کی طرف بڑھا اور گھر کے تمام کمروں میں یکے بعد دیگرے گھس کر ایک ایک گوشے میں نظریں دوڑا کر واپس نشست گاہ میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"صبح کہاں گئیں تھیں؟" وہ تیز نظروں سے بیوی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کہیں نہیں" شمع آہستہ سے بولی۔

"جھوٹ بول رہی ہو تم۔" وہ زور سے چلایا۔

"صاف صاف بتاؤ۔ جو بھی ہے کہہ دو۔ میں ناراض نہیں ہوں گا۔" جملے کا آخری حصہ مکمل کرتے ہوئے اس نے آواز خاصی دھیمی کر لی تھی۔

"چلو بتاؤ۔" وہ غصہ ظاہر نہ ہونے دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اور شمع جو لمحہ بھر پہلے اپنے اندر غم و غصے کے تلاطم کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے تھرتھرا رہی تھی، یکسر سوچنے لگی کہ وہ شہیر کو وہ سب بتا دے جو وہ جاننا چاہتا ہے۔ مگر۔ کیوں بتائے۔ یعنی اپنی صفائی پیش کرے؟ اس انسان کو جو...... جو...... جو ساری زندگی...... وہ سوچتی رہی۔ لیکن گھر کے سکون کی خاطر شہیر کا سب کچھ جان لینا ضروری ہے۔ نہیں گھر میں ایسا کون سا سکون ہے۔ کم سے کم یہ ہنگامہ تو پھر نہیں ہو گا۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ بتا دینا ہی بہتر ہو گا وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شہیر دھاڑا۔

"بولو۔ ورنہ۔ ورنہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔" وہ دانت پیستا ہوا بولا۔ اس کی یہ بات سن کر شمع کے تن بدن میں شعلے سے لپکنے لگے۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اتنا زوردار کہ وہ اپنی آواز خود ہی پہچان نہیں پائی۔ اور پیر پٹختے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ہفتے سے بدھ کے روز تک گھر میں تناؤ رہا۔ شمع پرسکون تھی۔ شہیر شدید ذہنی پریشانی سے

دو چار تھا دفتر میں بھی اس کا دھیان گھر کی طرف رہتا۔ وہ اکثر گھر کے ٹیلی فون نمبر پر انگلی رکھ دیتا۔ اور شمع کی "ہیلو" سن کر بغیر کسی گفتگو کے سلسلہ ختم کر دیتا۔

ان دنوں شہیر کی بے نوشی شدت پکڑ چکی تھی۔

"آج کل تم سے کوئی کام ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہا۔ تمہارا گھر میں دھیان ہوتا تو نا۔ بد سلیقہ عورت۔"

ایک رات بارہ بجے کے قریب اس نے سوئی ہوئی شمع کے قریب کھڑے ہو کر ایسی اونچی آواز میں کہا کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ بات ہی نہ کر پائی۔

"کک...... کیا ہوا؟" اس نے رُک رُک کر جلدی سے کہنے کی کوشش کی۔

"تم جانتی ہو کہ کبھی کبھی میں نمک زیادہ لینا چاہتا ہوں۔ کھانے کے پاس تم نے نمک کیوں نہیں رکھا تھا۔" وہ لڑکھڑاتی سی آواز میں بولا۔

"وہیں تو ہے ڈائننگ ٹیبل پر۔ بالکل درمیان میں۔ پھول دان کے پاس۔" شمع نے نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مگر اس کونے کے قریب کیوں نہیں رکھا تھا جہاں ہاٹ کیس اور پلیٹ رکھی تھی۔" اس نے جھولتا ہوا ہاتھ نچانے کی کوشش کی۔

"آپ اٹھا لیتے برابر سے۔"

"اٹھا لیتا۔ بے حیا۔ یہ کس نے تمہیں ہمت دی ہے جواب دینے کی۔ کس کی شے پر بولتی ہو حراف...... کون ہے وہ حرام...... کیا خاص بات ہے اس میں۔" یہ بات کہتے کہتے شہیر آئینے کے سامنے چلا گیا اور خود کو آئینے میں بغور دیکھتے ہوئے اپنی ٹائی ڈھیلی کرنے لگا۔ شمع ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

شہیر کی بدکلامی شمع کے لیے نئی نہ تھی۔ مگر یہ باتیں گھر میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں۔ شمع کو حالات کے اس سطح پر آجانے کا رنج ہو رہا تھا لیکن کہیں کہیں سے شاید وہ خوش بھی تھی کہ اس نے برسوں رو رو کر رشتے اور وفا کی دہائی دے کر شہیر سے کئی سوال کیے تھے مگر شہیر نے کبھی جواب تک دینے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ اور اب اس کو اس بے چارگی سے سوال کرتا دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خدا شہیر سے اس پر ڈھائے مظالم کا اسی طرح

بدلہ لے رہا ہے۔ اس نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا اور اندر جا کر نمک دانی ہاٹ کیس کے پاس رکھ دی اور منی کے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

شمع سوئی ہوئی مُنّی کے قریب لیٹ گئی۔ اس نے دو ایک گہری سانسیں لیں اور چھت کو دیکھنے لگی۔ دو آنسو اس کی آنکھوں کے بیرونی گوشوں سے نکل کر ڈھلکتے ہوئے اس کے کانوں کے پاس سے ہوتے ہوئے بالوں کو تر کر کے سرہانے میں جذب ہو گئے۔

اگلے دن جمعرات تھی۔ شہیر دیر تک سوتا رہا۔ جب جاگا تو اس نے شمع کو باورچی خانے میں مصروف پایا۔ لذیذ پکوان کی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ شمع نے ضرور کسی کو دوپہر کے کھانے کے لیے مدعو کیا ہے۔ اور اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی وہ آ جائے گا۔

"آپ گھر میں ہیں۔ آج؟" شمع نے چائے کمرے میں پہنچائی۔

"کیوں میرے یہاں رہنے سے تمہارے پروگرام میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے؟"

"نہیں۔ دراصل میں کہیں جا رہی تھی۔" وہ بے تاثر آواز میں بولی۔

"اوہ! تو مجھے گھر میں دیکھ کر تم نے ارادہ بدل دیا ہے۔" شہیر اس کی آنکھوں میں مسلسل دیکھتے ہوئے بولا۔ شمع کے دل میں نفرت کی لہر سی اٹھی۔ اس نے منہ دوسری طرف موڑ دیا۔

"اچھا تو اب۔ تم میری نظروں کا سامنا بھی نہیں کر سکتیں۔" شہیر نے دوسری طرف لگے آئینے میں شمع کی شبیہ سے کہا۔ اور اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

شمع نے بھورے رنگ کی لمبی سی قوسیہ دامن والی قمیض پہن رکھی تھی۔ اسی رنگ کا چوڑی دار پائجامہ اور چوڑی سی اوڑھنی، پیروں میں سیاہ جوتیاں تھیں۔ سر جھٹکے سے دوسری طرف موڑنے سے اس کی لمبی گھنی چوٹی پلٹ کر سامنے آ گئی تھی۔ اور گلے کے پاس سے ہوتی ہوئی گھٹنوں کو چھو رہی تھی اس کی گردن اور چہرہ اس لباس میں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے پتھروں کے درمیان سے سورج کی کرنوں کو منعکس کرتی ہوئی کوئی ندی بہہ رہی ہو۔ اس کے عکس کے ساتھ شہیر کا اپنا عکس بھی آئینے میں شامل ہو گیا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔ اس کے چہرے پر رات بھر کی اُگی ہوئی داڑھی میں کئی بال سفید تھے۔ شاید سگریٹ کی زیادتی سے..... بلانوشی کے بعد بسیار خوری سے چہرے اور بدن کی ضرورت سے زیادہ چربی جلد کی رنگت کو پیلاہٹ میں بدل چکی تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے چربی کی موٹی سی تہہ ایک

اور چوڑی سی ٹھوڑی بنا رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے کی کھال پانی کے بلبلوں کی طرح پھولی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں میں کچھ سرخی سی کچھ زردی سی تھی۔ چہرے پر بیماروں کی سی تھکن کے آثار تھے۔

شہیر اپنے اور اس کے عکس کو دیکھتا رہ گیا۔ شمع نے اس کی طرف ترس کھانے والی نظروں سے دیکھا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

کچھ وقفے سے وہ بڑا سا سیاہ بیگ لیے باہر جا رہی تھی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ گلی کے موڑ کے پاس پہنچ کر اس نے رکشے کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دور سے اسے شہیر اپنے تعاقب میں آتا دکھائی دیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مُنّی کو گھر میں تنہا چھوڑ آیا ہے۔ شمع نے تڑپ کر سوچا۔ وہ دوسری گلی سے واپس گھر کی طرف مڑ گئی۔ چابی دونوں کے پاس رہتی تھی۔ اس نے مُنّی کو ساتھ لیا اور گھر سے نکل گئی۔

شمع لڑکپن سے ہی صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی۔ شادی کے بعد اس کا آنسوؤں کا اور نماز کا ایک گہرا اور مضبوط رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ مگر رنج والم سہنے کی اس میں ایسی طاقت نہ تھی بس ایک اتفاق نے اسے یہ راستہ دکھا دیا۔ اور زندگی کا مفہوم دوسرا ہو گیا۔

وہ ایک بیمار سی شام تھی پیلے پیلے بادلوں نے آسمان کو ایک میلی سی اوڑھنی اوڑھا دی تھی۔ شمع نہایت اداسی اور بے چارگی کے عالم میں، گھر سے کچھ دوری پر واقع خواجہ کی درگاہ پر آ گئی تھی۔ جب سے ہی اس کے تڑپتے دل کو ایسا سکون ملا کہ وہ ہر جمعرات کو ظہر کی نماز وہیں ادا کرتی۔ خواجہ کے دربار میں۔

خواجہ کے فقراء کے لیے کبھی کھانا کبھی کھیر یا کبھی حلوہ بنا کر لے جاتی۔ کسی کونے میں بیٹھ کر قوالی سنتی۔ اور سنتے سنتے جانے کہاں پہنچ جاتی۔ کسی ایسے مقام پر جہاں سے لوٹ کر آنے کو اس کا جی نہ چاہتا۔ اس کا جی یہی چاہتا کہ یہ ماحول قائم رہے اور وہ اپنی ساری حیات جی لے۔ خواجہ کا دامن ہاتھ میں کیا آیا کہ اسے جینے کا مقصد مل گیا۔ خواجہ کی لگن نے اس میں زندہ رہنے کا حوصلہ بھر دیا۔ وہ خواجہ کے مساکین اور اپاہجوں کی غمگسار سی بن گئی تھی۔ پہلے وہ تھی اور اس کی محرومیوں کا غم، اب اس میں خواجہ کے سوالی اور اس کا عشق بھی شامل ہو گیا تھا۔

شہیر نے جب اسے گلی سے مڑتے ہوئے دیکھا تو رفتار تیز کر لی۔ بلکہ ایک رکشہ بھی لے

لیا مگر نکڑ کی دوسری طرف کی گلی میں وہ اسے کہیں نظر نہ آئی۔ وہ واپس گھر گیا تو مُنّی بھی نہ تھی۔

شمع جب درگاہ پہنچی تو ظہر کی نماز کے لیے صفیں بندھ چکی تھیں اور وہ خواتین کے لیے بنی عبادت گاہ میں داخل ہو گئی۔

صحن میں قوالوں نے سُر درست کیے اور ہارمونیم پر ایک پُرسوز سی دھن چھیڑنے کے ساتھ ساتھ ایک منقبت شروع کی۔

نمائندہ قوال نے رِشب سے شروع کر کے ایک خوبصورت سا الاپ دیا۔ لوگ ادھر ادھر سے آ کے آس پاس بیٹھنے لگے۔ شمع دعا مانگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر مُنّی کے پاس آ گئی۔ اور بیگ میں رکھا پکوان خیرات کی پیٹی کے پاس بیٹھے مجاور کے حوالے کیا تاکہ وہ اسے تقسیم کرے کہ اس ہجوم میں ایسا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

اس کے بعد وہ قوالی کے سامعین کے دائرے کی آخری قطار سے کچھ دور مُنّی کو لیے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا چادر نما دوپٹہ ایسے اوڑھ رکھا تھا کہ اس کے چہرے میں سے صرف اس کی دو آنکھیں اور رخسار کا ایک کونہ نظر آ رہا تھا۔

قوالی اپنے شباب پر تھی۔ ہارمونیم کے موسیقی کے ساتھ تالی کی تال اور طبلے کی تھاپ جیسے روح پر پڑ رہی تھی۔ قوالی راگ برندابنی سارنگ میں گائی جا رہی تھی۔ جو دوپہر کے وقت ہی گایا جاتا ہے۔

میرا پیا گھر آیا ہو لال نی — اللہ نے ملایا کمال نی
گھڑی گھڑی گھڑیال بجاوے — رین وصل دی پیا گھٹاوے
میرے من دی بات نہ پاوے — وچھڑنا ہویا محال نی

شمع کا دل رقص کر رہا تھا۔ روح جیسے کہ عرش کے قریب ہی کہیں روشنیوں کے دوش پر تیر رہی تھی۔ وقت کے گزرنے کا کوئی احساس نہ تھا۔

پھر کسی وقت قوال نے منقبت ختم کی اور نعت شروع کی۔ دوپہر کے ہی ایک راگ بھیم پلاسی میں۔ کہتے ہیں۔ راگ اگر اپنے منتخب اوقات میں گائے بجائے جائیں تو انسان تو کیا چرند و پرند بھی جھوم اٹھتے ہیں۔ مگر درگاہ میں وہ سماں تھا کہ اگر راگ کسی اور وقت بھی گائے جاتے تو کچھ فرق نہ پڑتا کہ ماحول time اور space کی بندشوں سے ماورا تھا۔ فضا میں اگربتی اور لوبان کی مہک رچی تھی۔ دربار خواجہ کا تھا اور ذکر دو جہاں کے بادشاہ کا تھا۔

تاجدارِ حرم ہو نگاہِ کرم ہم غریبوں کے دن کب سنور جائیں گے
والیِٔ بیکساں کیا کہے گا جہاں آپ کے در سے خالی اگر جائیں گے

شمع کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ اپنی چادر کا کنارہ ناک کے اوپر سے لا کر دانتوں میں دبائے دونوں ہاتھ چہرے پر دھرے وہ چپکے چپکے سسک رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جسم اور روح دو الگ الگ چیزیں ہو کر رہ گئی ہوں۔ منّی اس کے زانوں پر سر رکھے منہ میں انگھوٹھا ڈالے سو رہی تھی اور خود شمع جانے کہاں تھی۔

قوالی ختم ہوئی تو وہ اچانک جیسے کہ ہوش میں آ گئی۔ مؤذن عصر کی اذان دینے والا تھا۔ اس نے چادر سے چہرہ پونچھا، آنکھیں خشک کی۔ مجاور جانے کب اس کا خالی بیگ اس کے پاس رکھ گیا تھا۔ اس نے بیگ تہہ کر دیا اور آہستگی کے ساتھ اسے منّی کے سر کے نیچے رکھ کر خواتین کے لیے مخصوص، عبادت گاہ میں داخل ہو گئی۔

گھر لوٹتے وقت اس کا سر بھاری تھا، مگر دل تتلی کی طرح ہلکا۔

وہ نہایت پُرسکون سی گھر کے اندر داخل ہوئی۔ خواجہ کے دربار کا سکون و سرور اس کی جسم پر حاوی اور روح میں حلول تھا۔ سماعت میں نغمے گونج رہے تھے۔ دماغ خوشبوؤں کے حصار میں تھا، دل پر عشق کا قبضہ تھا۔ جیسے وہ ہواؤں میں تحلیل ہو کر دور ریگستانوں کے اُس پار پہنچ گئی ہو۔ اور اس سرزمین کا جی بھر کے طواف کرنے کے بعد اب مطمئن لوٹی ہو۔ اس کے سارے دکھ ختم ہو گئے ہوں۔ سارے غم دھل گئے ہوں اور کسی معصوم بچّے کی طرح اسے کوئی فکر و پریشانی نہ ہو۔

سوئی ہوئی منّی اس کے شانے سے لگی تھی۔ اور سوجی ہوئی آنکھیں ابھی بھی پوری طرح وا نہ تھیں۔ وہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی کہ ایک تیز دھماکہ ہوا جیسے خاموش وادیوں میں کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔

''کہاں سے آ رہی ہو تم'' شمع نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اودھر ادھر دیکھا شبیر نشست گاہ کے درمیانی صوفے کے کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹی۔ وی کا ریموٹ کنٹرول تھا اور وی چینل پر نیم برہنہ لڑکیاں رقص کر رہی تھی۔ اس نے ٹی وی کی آواز بند کر رکھی تھی۔

''کچھ کام۔ کام تھا مجھ کو'' شمع نے منّی کو صوفے پر لٹا دیا۔

"بغیر بتائے منّی کو مت لے جایا کرو تم۔ میری طرف سے۔ تم چاہے بھاڑ میں جاؤ۔" وہ دانت پیستے ہوئے نتھنے پھلا کر بولا۔ شمع اب پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔

"ٹھیک۔ ہے" وہ آہستہ سے بولی۔ اور پانی پینے لگی۔

"آخر تم جاتی کہاں ہو؟ بتاؤ مجھے۔" وہ دہاڑا۔ شمع نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کہاں سے آ رہی ہو۔ تم۔ بتاؤ" اس کا یہ جملہ سن کر شمع پانی کا گھونٹ منہ میں لیے نگلے بغیر شہیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس جملے میں ایک گلہ تھا۔ جو شمع نے پہلی بار محسوس کیا۔ ایک شکوہ تھا۔ جو آج تک شہیر کی آواز میں سنائی نہ دیا تھا۔ ایک شکست تھی۔ جس کا وہ کبھی عادی نہ تھا۔ اور ایک التجا تھی۔ جو برسوں پہلے اس کی باتوں میں ہوا کرتی تھی۔ جب وہ شمع کی معصومیت کو اچھا لگنے لگا تھا۔

شمع گلاس لبوں سے لگائے سوچتی رہ گئی کہ کیا وہ شہیر کی لاپرواہیاں بے وفائیاں اور بدزبانیاں معاف کر کے اسے شکوک کے سلگتے آتش فشاں سے کھینچ لے یا اس کی دی ہوئی الم زدہ تنہائیوں کے بدلے میں اسے بھی ساتھ رہ کر تنہائیاں سونپ دے۔

□□

("مژگاں" کلکتہ، ۲۰۰۰ء)

● ترنم ریاض کے افسانوں کی جو فضا ہے وہ بڑی مانوس سی فضا ہے جس سے ہم سب واقف ہیں۔ ان کے اظہار میں کوئی تصنع آمیز صنائی نہیں ہے۔ بہت ہی صفائی اور شستگی کے ساتھ وہ اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتی ہیں۔ کہیں کہیں تو ان کے اسلوب میں خاص طرح کی مقناطیسیت آجاتی ہے جو اپنے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کو بہالے جاتی ہے۔ ترنم ریاض اپنی سادی بے تکلفی اور بے ساختگی کی وجہ سے ہمیں ہمیشہ متاثر کرتی ہیں۔

—— مظہر امام

● پچھلے ۴۰-۵۰ برسوں میں اردو میں چند ایسی افسانہ نگار پیدا ہوئیں جنھوں نے خوبصورت افسانوں سے ادب کو مالا مال کیا۔ اُس نسل سے تو نہیں لیکن اُس قبیل سے ترنم ریاض کا بھی تعلق ہے۔ ترنم ریاض بہت دنوں سے کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کم لکھتی ہیں، کم شائع ہوتی ہیں۔ ان کی خاصیت یہ ہے کہ افسانہ لکھتے وقت بہت زیادہ صناعی کی قائل نہیں ہیں۔ وہ اسی انداز سے افسانہ لکھتی ہیں جیسے رو برو گفتگو میں مشغول ہوں وہ قاری کی ذہن پر کچھ اس قسم کا سحر کر دیتی ہیں کہ اس کا ذہن اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں پاتا۔

—— محبوب الرحمان فاروقی

● ترنم ریاض نے افسانے کی دنیا میں بہت جلد ایک مقام بنا لیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ ترنم ریاض بہت سوچ سمجھ کر اپنے موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں اور انھیں بکھرنے نہیں دیتیں۔

—— عبدالصمد

● ترنم ریاض کے ہاتھ میں قلم نہیں 'موقلم' ہے جس کی ہلکی ہلکی جنبشوں سے وہ افراد کے پورٹریٹ تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کو کینوس پر اتار دیتی ہیں۔ کبھی کبھی ان کی کوئی کہانی جس میں ازدواجی زندگی کے پرتو جھلکتے ہیں۔ مجھے ممتاز شیریں کی کہانیوں کی یاد دلاتے ہیں۔

ترنم ریاض کی ہر کہانی ایک ڈرامائی انداز سے شروع ہوتی ہے، پھر لحظہ بہ لحظہ آگے بڑھنے لگتی ہے، پہلے آہستہ پھر رواں دواں۔ پتہ نہیں کیوں لارڈ بائیرن کا یہ جملہ بار بار میرے ذہن میں ابھر رہا ہے۔

'Man's love is of man's life' a thing apart
It's woman's whole existance,.

—— نرنجن تسنیم

نام : ترنّم ریاض

جائے پیدائش : سرینگر (کشمیر)

تعلیم : ایم۔اے، ایم۔ایڈ

پتہ : C-11، جنگ پورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی-110014

تصانیف:

- یہ تنگ زمین (افسانوی مجموعہ) ۱۹۹۸ء
- ابابیلیں لوٹ آئیں گی (افسانوی مجموعہ) ۲۰۰۰ء
- ہاؤس بوٹ پر بلی (ترجمہ: انگریزی سے۔ برائے ساہتیہ اکادمی، دلّی) ۱۹۹۳ء
- سنو کہانی (ترجمہ: ہندی سے۔ برائے ساہتیہ اکادمی، دلّی) ۱۹۹۳ء
- گوسائیں باغ کا بھوت (ترجمہ: ہندی سے۔ برائے ساہتیہ اکادمی، دلّی) ۱۹۹۸ء

زیر طبع:

- صحرا ہماری آنکھ میں (ناول)
- حکایتِ حرفِ تمنّا (شعری مجموعہ)
- چشمِ نقشِ قدم (تنقیدی و تحقیقی مضامین)
- بیسویں صدی میں خواتین کا ادب (انتخاب: برائے ساہتیہ اکادمی، دلّی)

اعزاز:

- اُتر پردیش اُردو اکادمی انعام برائے سال ۱۹۹۹ء

مشغلہ:

- ریڈیو اور ٹیلی ویژن نشریات سے وابستگی

ABABEELEN LAUT AAYEN GI

(Collection of short stories)

By Tarannum Riyaz

C-11, Jangpura Extn. New Delhi-110014